حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

فروری 2019ء

-/30 روپے

UGC'S Approved Urdu Journal-S.No.41103

ISSN-2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پروفیسر ایس اے شکور اسپیشل آفیسر تلنگانہ حج کمیٹی کی ہندوستانی حجاج کرام برائے سال 2019 کے لئے مکہ مکرمہ میں قیام گاہوں کے
انتخاب کے سلسلہ میں سعودی عرب کے دورے کے موقع پر بزم عثمانیہ جدہ کی جانب سے خیر مقدمی تقریب منعقد ہوئی۔
تصویر میں عارف قریشی صدر بزم عثمانیہ جدہ، جناب حلیم بابر، بزم جدہ کے ارکان و معززین دیکھے جاسکتے ہیں

حیدرآباد لٹریری فیسٹیول 2019ء کے موقع پر تلنگانہ کی ادبی تہذیب پر منعقدہ مذاکرہ میں پروفیسر بیگ احساس،
جناب اشوک تنگا سالا، محترمہ مری مارگریٹ اور موڈریٹر پروفیسر ٹی۔ وجے کمار

بنیاد گزار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۱ شمارہ: ۲ ماہ: فروری سال: ۲۰۱۹ء

مجلس ادارت

- سرپرست: راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی
- صدر: جناب زاہد علی خاں
- معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

- پروفیسر گوپی چند نارنگ
- جناب مجتبیٰ حسین
- پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِ سالانہ

- ہندوستان: **300** روپے
- پاکستان و بنگلہ دیش: 600 روپے
- کتب خانوں سے: **400** روپے
- مغربی و عرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

قیمت: -/30

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد 500 082. انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طاہا پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
من پسند اور
آزمودہ نسخہ

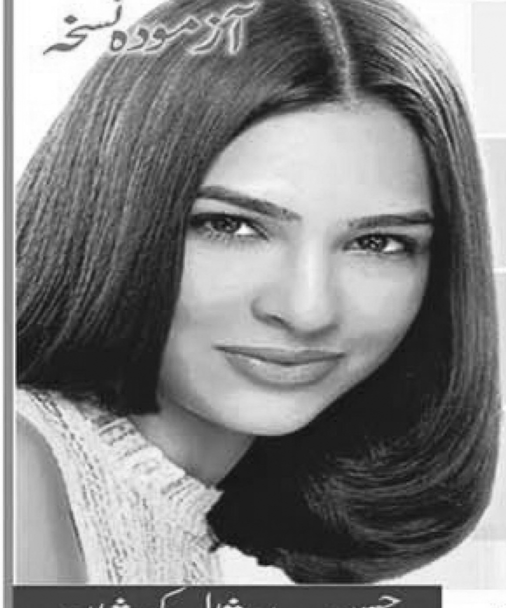

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفا دور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاوڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑ، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاوڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاوڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان

جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

®

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS

Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES

Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.

Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ھے

اس شمارے میں

اداریہ

بیگ احساس — 6

مضامین

نسائی ادب میں سیاسی وسماجی عدم استحکام کی عکاسی — آمنہ تحسین — 8

قومی تحریکِ آزادی اور پریم چند — شمیم رغبت ملک — 20

انٹرویو

عجز وانکسار کا پیکر۔مجتبیٰ حسین — سہیل وحید — 34

یادیں — راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی — 45

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر — سعیدہ بانو احمد — 50

شاعری

بی ٹاافرح تزئین، مصحف اقبال توصیفی، روف خیر، اکرم نقاش، — جمال اویسی، سیفی سرونجی، شاہد اختر — 57

افسانے

بون۔سائی — محمد یحییٰ جمیل — 64

گمشدہ پیلی تتلی — احسن ایوبی — 68

مطالعہ

رسالہ نیادور کا مجتبیٰ حسین نمبر — بی بی رضا خاتون — 77

اداریہ

30ر جنوری کو ساری قوم مہاتما گاندھی کی موت کا سوگ مناتی ہے۔ سرکاری اداروں اسکولوں اور جامعات میں دو منٹ کی خاموشی منائی جاتی ہے۔ لیکن اس سال 30ر جنوری کے دن اخبارات اور میڈیا خاموش رہے۔ مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کا فلسفہ دیا۔ صرف نظریاتی نہیں بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ گاندھی جی نے دیہات کے رہنے والوں اور بچھڑے ہوئے طبقا تکو ملک کی سیاست سے جوڑنے کا اہم کام کیا۔ گاندھی جی تقسیم کے مخالف تھے اور ادھر نہرو اور سردار پٹیل ادھر محمد علی جناح تقسیم ہند چاہتے تھے۔ گاندھی جی ملک کو تقسیم سے بچا نہ سکے لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ یکساں انصاف کے قائل تھے۔ گاندھی جی کی یہ رواداری بعض حلقوں کو پسند نہ تھی چناں چہ 20ر جنوری کو پوجا کے دوران ایک بم پھینکا گیا جو مدن لال نامی پنجابی مہاجر نے پھینکا تھا۔ گاندھی جی کو گمان بھی نہ تھا کہ انھیں مارنے کی کوشش کی جائے گی۔ گاندھی جی نے ہندوستانی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف اپواس رکھا تھا کہ پاکستان کو واجب الادا پچاس کروڑ روپے روک لیے جائیں۔ گاندھی جی کی ضد کے آگے ہندوستان سرکار کو جھکنا پڑا۔ پاکستان کو پیسہ ادا کر دیا گیا لیکن گاندھی جی کے اس عمل سے کٹر ہندو سخت ناراض ہو گئے۔ انہیں ایسا لگا جیسے گاندھی جی مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں (آج بھی ان کی یہی ذہنیت ہے) اس کے بعد سکیورٹی بڑھا دی گئی لیکن گاندھی جی نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی اور نہ وہ خوف زدہ ہوئے۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان کی زندگی بھگوان کے ہاتھ میں ہے اگر انھیں مرنا ہے تو وہ مر جائیں گے''30ر جنوری کو گاندھی جی پرارتھنا کے لیے مخصوص چبوترے کو لگی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے لوگ ہاتھ باندھے گاندھی جی کے استقبال میں کھڑے تھے۔ لوگ گاندھی جی کے لیے راستہ بنا رہے تھے اسٹیج سیڑھیوں سے قریب 25 فٹ اوپر تھا اسٹیج پر ایک فٹ اونچی لکڑی کی ڈائس تھی۔ گاندھی جی اسی پر بیٹھتے تھے قاتل (ناتھورام گوڈسے) اسی بھیڑ میں گاندھی جی کا انتظار کر رہا تھا وہ اپنی جیب میں ریوالور چھپائے ہوئے تھا۔ گاندھی جی نے بہ مشکل پانچ چھ قدم بڑھائے ہوں گے قاتل نے بالکل قریب سے لگاتار کئی گولیاں فائر کر ڈالیں گاندھی جی وہیں ڈھیر

ہو گئے اور لمحوں میں رخصت ہو گئے ان کی موت اس معنی میں عظیم تھی کہ ان کی روح تب پرواز ہوئی جب وہ خدا کی طرف رجوع ہونے جا رہے تھے۔ (مہاتما گاندھی کے پرسنل سکریٹری وی کلیانم کی زبانی ترجمہ: سید کاشف۔فیس بک گروپ عالمی افسانوی ادب)

30 رجنوری 2019ء کو علی گڑھ میں ہندو مہا سبھا کے سات افراد نے مذموم حرکت کی۔ گاندھی جی کی تصویر رکھی گئی اور اس پر ایک خاتون نے نقلی پستول سے گولیاں چلائیں۔ گویا ناتھورام گوڈسے کو خراج پیش کیا جا رہا ہو۔ برسر اقتدار افراد کی یہی کوشش ہے کہ گاندھی جی کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ وزیر آعظم نے رسماً گاندھی جی کی تصویر پر پھول مالا بھی چڑھائی۔ لیکن اگر کوئی چھوٹا سا گروپ اس طرح کی ذلیل حرکت کرنے کی ہمت کر رہا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ ماحول ہے جو یو پی میں تیار کیا گیا ہے۔ یہ ویڈیو سوشیل میڈیا پر وائرل ہوا۔ اس خاتون کی تصویریں بھی سوشیل میڈیا پر دیکھی گئیں جس میں وہ خاتون بڑے بڑے وزیروں اور لیڈروں کے ساتھ موجود ہے۔ بعد میں اس گروپ کی گرفتاری کی اطلاع بھی چھپی لیکن یہ گرفتاری کتنی اصلی ہے کہا نہیں جا سکتا۔

غالباً اس طرح کی ذہنیت رکھنے والے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ 30 رجنوری کو روایت کو ختم کر کے گاندھی جی کو نئی نسل کے ذہنوں سے بھلا دیا جائے گا۔ کوئی دن منانے یا نہ منانے سے آئیڈیالوجی کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ گاندھی جی کے نظریات اور افکار کی ساری دنیا معترف ہے۔ ایک ایسے وقت جب پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی پرتشدد تباہیوں سے ساری دنیا خوفزدہ تھی گاندھی جی نے عدم تشدد کا فلسفہ دے کر سب کو حیران کر دیا۔ اسی صبر و تحمل کے ساتھ آزادی کی لڑائی جیت کر ساری دنیا کو حیرت زدہ کر دیا لیکن ملک کی تقسیم کے سانحے نے گاندھی جی کو بہت بددل کر دیا تھا۔ گاندھی جی نے اپنے لیے کچھ نہیں چاہا وہ ایک بے نیاز آدمی تھے۔ اس مذموم واقعے کے لیے علی گڑھ کا انتخاب شاید اس لیے کیا گیا کہ علی گڑھ اور دوسرے مسلم ادارے آر ایس ایس ذہنیت رکھنے والوں کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں۔ کبھی اقلیتی کردار ختم کرنے کی بات کی جاتی ہے کبھی ریزرویشن کا مسئلہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ اب کیمپس میں مندر بنانے کا شوشہ چھوڑا گیا۔ کانگریس پارٹی نے بھی اس واقعے پر کوئی خاص ردّ عمل نہیں دکھایا۔ وہ الیکشن کی تیاری میں جٹے ہوئے ہیں۔ پرینکا گاندھی کی آمد کا جشن منایا جا رہا ہے۔ ممتا بنرجی، مایاوتی اور راہول گاندھی کے دل میں وزیر آعظم بننے کی خواہش چٹکیاں لے رہی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اپوزیشن متحد ہو کر ایک خاص حکمت عملی تیار کرے اور آپسی ٹکراؤ سے گریز کریں۔ جن لوگوں نے ملک کو آزادی دلائی ان کا احترام کریں اور گاندھی جی کے خوابوں کا ہندوستان بنائیں۔

☆☆☆

مشہور فکشن نگار اقبال مجید بھی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اقبال مجید کا تعلق اس نسل سے تھا جو ترقی پسند تحریک کے بعد ابھری۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے درمیان اس نسل نے افسانے کو بچائے رکھا۔ ادارہ مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

بیگ احساس

مضمون

آمنہ تحسین

نسائی ادب میں سیاسی وسماجی عدم استحکام کی عکاسی

(کشمیر کے حوالے سے ایک مطالعہ)

ہندوستان کو عالمی سطح پرامن وامان، مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی و بھائی چارہ کے گہوارہ کی حیثیت حاصل رہی ہے ۔تاہم پچھلی دہائیوں میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کے نتیجے میں بدلتے حالات نے ہندوستان کی شبیہ کو بدل کر رکھ دیا ہے ۔بالخصوص ملک کے چند علاقے ایسے ہیں جہاں برسوں سے سیاسی اورسماجی سطح پر مسلسل انتشار اور عدم استحکام کا ماحول پایا جاتا ہے ۔جس میں سرفہرست ریاستِ جموں وکشمیر کو رکھا جاسکتا ہے۔ اگر چہ کہ موقع بہ موقع میڈیا یا مختلف رپورٹس کے ذریعہ سے کم وبیش ان تمام حالات سے آگاہی ہوتی رہتی ہے لیکن ادب چونکہ سماج کا آئینہ ہوتا ہے جس میں معاشرتی زندگی کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ءسماج کی حقیقی صورتِ حال کو جاننے کے لیے معاصر ادب کو ایک اہم ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔

یو۔این ہیومین رائٹس کمیشن، ایمنسٹی انٹرنیشنل انڈیا کی رپورٹس کے علاوہ دیگر تحقیقی رپورٹس کے مطابق گذرے برسوں کے دوراں ریاستِ جموں وکشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی، سماجی عدم مساوات، سیاسی انتشار اورسماجی خلفشار وافراتفری کے نتیجے میں سخت بحران پیدا ہوگیا ہے ۔مسلسل کشیدہ حالات نے پورے سماج میں بے سکونی و اضطراب کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ ان رپورٹس کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر میں بڑے عرصہ سے پرآشوب حالات کی بنا پر مردوں کے مقابلے میں خواتین کی بڑی تعداد متاثر ہوئی ہے۔ مسلسل رونما ہو نے والے ہنگامی واقعات ، خاندان کے ذمہ داران کی موت یا گمشدگی ،جبرو استحصال، خوف وہراس کے ماحول میں خواتین کے لیے جہاں تعلیمی ،معاشی ،سماجی وثقافتی سطح پر بے شمار چیلنجس ابھر آئے ہیں وہیں بالا دستی اورعدم تحفظ کے احساس سے خواتین کی ایک بڑی تعداد نفسیاتی مسائل کا شکار ہوگئی ہے۔(۱)

پدر سری معاشروں میں پاور ریلیشن یا حاکمیت نیز خوف ودہشت کو جاری رکھنے کے لیے ہمیشہ خواتین پر جنسی تشدد کا سہارا لیا جاتا رہاہے۔ مختلف حالات میں خواتین بطور ہتیار استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ اگر چہ کہ سماج غیر مہذب تمدن سے مہذب تمدن کی طرف صدیوں پہلے سفر طے کر گیا لیکن خواتین کے ساتھ جبر واستحصال نیز غیرانسانی سلوک کا سلسلہ مختلف شکلوں میں آج بھی اسی طرح رائج ہے۔ جس طرح سے غیر مہذب سماج میں مروج تھا۔ ہندوستانی سماج میں خواتین یوں تو بے شمار مسائل سے دوچار ہیں لیکن دیگر مقامات کی بہ نسبت عدم استحکام والے علاقوں میں خواتین کے اندرونِ خانہ وبیرونِ خانہ مصائب مزید کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ ایک طرف ہر قدم پر انھیں عصمتوں کے لٹنے کا ڈر اور جنسی استحصال کا خوف ہوتا ہے تو دوسری طرف کئی مرحلوں پر صنفی تشدد یا تفرقہ سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ علاقہ کشمیر میں خواتین کے موجودہ موقف کا جائزہ لیا جائے تو یہ تمام حقائق سامنے آتے ہیں۔ علاوہ ازیں کشمیر کی خواتین کے سنگین مسائل کو سمجھنے کے لیے عصرِ حاضر میں وضع کی گئیں ، Half Widow,Half Mother, Half Orphan جیسی اصطلاحات کافی ہیں۔ جو ایک ایسے سماج کی نشاندہی کر رہی ہیں جہاں عورت نہ صرف بیوہ کے طبقہ کی شناخت رکھتی ہے بلکہ اب دیگر ناموں سے بھی جانی جانے لگی ہے

اور سماج کے مختلف سطحوں پر اپنے شکستہ وجود کے ساتھ بے پناہ مسائل سے جوج رہی ہے۔(۲)

کشمیر میں خواتین کا یہ متذکرہ موقف تحقیقی رپورٹس کی شماریات پر مبنی ہے۔شماریات کی بنیاد پر ہم یہ با آسانی جان سکتے ہیں کہ کب، کہاں، کیسے اور کتنی خواتین مختلف حالات کا شکار ہوئی ہیں او روہ تعلیمی ،معاشی، صحتی یا سماجی طور پر کیسے متاثر ہو ئی ہیں۔تاہم ان رپورٹس کے تناظر میں یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ

کیا وہ رپورٹس ایک زندہ درگور عورت کے مکمل حالات کی ترجمانی کر پائی ہیں؟ یا عورت کے شکستہ وجود، اندرونِ ذات و بیرونِ ذات تصادم، اس کی ذہنی و جذباتی کشمکش اور اس کے داخلی کرب واضطراب کی تمام تر کیفیات کی پیمائش کر پائی ہیں جس سے کہ پچھلے کئی برسوں سے کشمیر کی خواتین دوچار ہیں جیسے یہ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے

☆کرفیوزدہ شہر کی / بیوہ سڑکیں / آنکھیں کھولتی ہیں / نگر کے گربھ میں / کیا دیکھتی ہیں نہیں معلوم

/حیرت زدہ ہیں/دھرتی شائد/گربھ دھارن / کر رہی ہے / چاند چھپ کر/

کھڑکیوں سے جھانکتا ہے/آوارہ کتے / ٹولیوں میں بھونکتے ہیں/

زندگی / برہنہ سو رہی ہے / میں رات سی کٹ رہی ہوں / پوری وادی میں / کرفیو نافذ ہے

(شبنم عشائی)

☆یہ قبرستان سی بستی / یہ سناٹا / یہ دھڑکن / جس طرح بارود پھٹنے کی صدا / کتنے پرانے گلشتوں میں ہیں نئے کتبے/

ہوئے ضائع جواں / بوڑھی ہوئی ہیں لڑکیاں / اے مہرباں / کر رحم اس مخلوق پر / اے خالقِ ارض وسماں

/ یا صبر دے ایوب کا / یا چھین لے ہوش وحواس / ٹوٹ جائے نہ کہیں / زخمی دلوں کی آس / اب تو رکھ دعا کا پاس

(ترنم ریاض)

☆ظلمتوں کے دشت میں اب کس لیے بھٹکا کروں
مجھ کو میرے خضر نے وہ راہ دکھلائی نہ پوچھ
پھوٹتے ہیں آگ کے شعلے گلوں کے لمس سے
ایسے عالم میں بدن کی ناشکیبائی نہ پوچھ

(رخسانہ جبین)

☆ہے دریدہ جسم، الجھی زلف اور ویراں نظر
زندگی زندہ پھر بھی حادثوں کے باوجود
موسموں کی سازشیں تھیں یا سیاست وقت کی
اے نظر فصلیں جلیں کیوں بارشوں کے باوجود

(نکہت فاروق نظر)

متذکرہ بالا نسائی فکری اظہار ایک ایسی عورت کے داخلی کرب، خوف وسراسیمگی، رنج وغم، احساسِ شکست اور ذہنی ونفسیاتی کیفیات کا ترجمان ہے جو روزمرہ زندگی میں سخت ترین آزمائشوں اور پرآشوب حالات سے جوج رہی ہے اور مختلف اسباب کی بنا پر دھیرے دھیرے ایک مضطرب وجود میں ڈھل کر سماج میں ایک ''متاثرہ یا استخراجی فرد'' کی حیثیت اختیار کر رہی ہے۔ پرآشوب حالات سے متاثرہ خواتین کی متذکرہ اضطرابی کیفیات سماجی مطالعات کا تب تک حصہ نہیں بن سکتیں جب تک کہ ''ادبیات'' کو تحقیق وتجزیہ میں شامل نہ کیا جائے۔ادبیات کا مطالعہ اس وقت اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب ہم عورت کے وجود سے جڑے ہمہ پہلو مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ کیونکہ عورت کی ذہنی وجذباتی کیفیات اور کرب کا اظہار ان کی تحریروں میں بخوبی ہوتا ہے لہٰذا اس ضمن میں ''نسائی ادب'' کا مطالعہ اہم ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔جس کے حوالے سے سماج میں عورت کے موقف ومسائل کو جاننے اور

اس کے مکمل وجود کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ چونکہ مطالعاتِ نسواں' عورت کے مسائل کو جاننے ،اس کے مکمل وجود کو سمجھنے نیز اس کی فکر وشعور کی تفہیم وتشریح سے عبارت ہے اسی لیے مختلف زاویوں سے نسائی ادب کا مطالعہ نہایت سودمند ثابت ہوتا ہے ۔ بالخصوص نسائی ادب کے حوالہ سے شورش زدہ علاقوں میں خواتین کے موقف اور ان کے پیچیدہ مسائل کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے ۔ چونکہ عالمی وقومی سطح پر خواتین کے غیر مواقف موقف اور حاشیائی حیثیت کو ختم کرنے ،انھیں ترقی کے مرکزی دھارے میں شامل کرنے نیز تحفظ بھری زندگی کے ساتھ انھیں با اختیار بنانے کے لیے مباحث کا سلسلہ یوں تو بین الاقوامی خواتین کے دہے (85-1975) سے شروع ہو چکا اور تا حال اس جانب کئی ایک ٹھوس اقدامات اپنائے گئے ۔تاہم مجموعی طور پر سماج میں عورت کے موقف کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان اقدامات کے کوئی خاطر خواہ اثرات مرتب نہیں ہو پائے ۔اسی تناظر میں یہ بحث بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ بحران زدہ سماج کی عورت کے مسائل کو ان کی پوری صداقتوں کے ساتھ کس طرح سمجھا جائے اور ان کا تدارک کیوں کر ممکن ہو۔لہٰذاء زیرِ بحث مقالہ میں نسائی ادب کا مطالعہ ان ہی مقاصد سے کیا گیا ہے تا کہ یہ سمجھا جا سکے کہ

خواتین بہ حیثیت ایک حساس سماجی فرد کے عدم استحکام کے حالات سے ذہنی وجذباتی سطح پر کس طرح متاثر ہوتی ہیں؟اور ان حالات سے پیدا ہونے والے اضطراب کی عکاسی ان کے ادب میں کیسے کی جاتی ہے؟ دوسرے ایک عورت ہونے کے ناطے بحران زدہ سماج میں عورت کی حیثیت کو تخلیق کار خواتین نے کس طرح سے دیکھا اور ان کے مسائل کو کیسے پیش کیا؟

تخلیق کار بالواسطہ طریقے سے اپنی تحریروں میں معاشرتی تاریخ رقم کرتا ہے ۔تخلیق کار کا اپنے عہد کی زندگی اور مسائل کو دیکھنے کا نظریہ دیگر افراد سے بالکل جدا ہوتا ہے ۔اس کی فکرِ رسا اسے شعور وآگہی کے ساتھ اندرونِ ذات سے بیرونِ ذات تک کا سفر کرواتی ہے اور مختلف حالات کے پس منظر میں انسانی فطرتوں نیز جذبات واحساسات کے مدوجزر سے روبرو کرواتی ہے ۔ان ہی کیفیات کو تخلیق کار ضبطِ تحریر میں لاتا ہے اور زندگی کو اس کی پوری سچائیوں کے ساتھ ادبی پیرہن میں پیش کر دیتا ہے ۔جیسا کہ پروفیسر ریاض پنجابی لکھتے ہیں کہ

''ایک تخلیقی ذہن کا اپنے گرد وپیش کو دیکھنے کا ایک الگ اور جداگانہ انداز ہوتا ہے ۔۔۔

اس طرح کا ذہن اپنی بصیرت اور بصارت کے

مطابق جس انداز اور نظر سے سماجیات ،تاریخ

اور عصرِ حاضر کی پیچیدگیوں کا تجزیہ کرتا ہے

وہ اسے ایک صحافی یا دیگر اس زمرے میں شامل

صاحبِ قلم افراد سے ایک الگ اور منفرد

مقام عطا کرتا ہے''(۳)

تخلیق کار خواہ مرد ہو کہ خواتین سماج کے حساس فرد کی حیثیت سے تاریخ رقم کرتے ہیں ۔تاہم زندگی کے کئی معاملات میں خواتین نہایت حساس و جذباتی ہوتی ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی بڑا گہرا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ ایک باشعور وحساس ذہن فرد کی حیثیت سے اپنے اطراف واکناف کے ماحول سے اثرات قبول کرتی ہیں اور جب اپنے تجربات ومشاہدات کو تخلیقات کا حصّہ بناتی ہیں تو وہ فکری اظہار چونکہ عورت کے داخلی کرب کا ترجمان ہوتا ہے اسی لیے کئی سطحوں پر منفرد ہوتا ہے اور اپنی انفرادیت کے ساتھ یہ ادبی سرمایۂ تاریخ ، سماجیات ، نفسیات ، سیاسیات ، معاشیات وانسانیات ،یعنی مختلف علوم کا ایک اہم ماخذ بن جاتا ہے ۔جس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔

سرزمینِ کشمیر ماضی میں صوفیوں ورشیوں کا مسکن رہی ہے۔خوبصورت مناظر،علم،ادب وثقافت سے مالا مال اس سرزمین پر نسائی ادب کی روایت کافی قدیم ہے اور توانا بھی ہے ۔تقریباً چودہویں صدی میں سماجی بندشوں اور فرسودہ روایتوں کے خلاف اپنے اضطراب ومزاحمت کا جو بیج للّا عارفہ (لال دید) نے بویا تھا اور نسائی فکر واظہار کے جو گل وبوٹے کھلائے تھے ان کا تسلسل سولہویں صدی کی حبّہ خاتون سے ہوتا ہوا عصرِ حاضر کی قلم کار خواتین تک آ پہنچا ہے۔کشمیری زبان کے علاوہ دیگر زبانوں بشمول اردو کے ان کی نثری وشعری تخلیقات منظرِ عام پر آتی رہی ہیں اور چمنستانِ ادب میں اضافہ کا باعث بنتی رہی ہیں۔اردو زبان کے حوالے سے عصرِ حاضر کے نسائی ادب میں نصرت چودھری،شفیقہ پروین،نصرت رشید، عابدہ احمد،رخسانہ جبین، ترنم ریاض،شبنم ہاشمی،نکہت فاروق نظر،سیدہ نسرین نقاش،پروین راجہ،صاحبہ شہریار، زنفر کھوکر، نیلوفر ناز نحوی قادری، روبینہ میر، نعیمہ احمد مہجور، دیبا نظیر، رفعت حجازی،فریدہ کول،رابعہ ولی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ معاصر خاتون تخلیق کاروں نے عالمی وقومی سطح کے مسائل کے علاوہ اپنے گرد ونواح کے شورش زدہ واقعات و حالات کو نہایت موثر طریقے سے اپنی تحریروں کا حصّہ بنایا ہے۔ان کی تخلیقات میں سماجی اضطراب کی مختلف نوعیّتوں کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔اس مقالہ میں کشمیر کے حالات کے تناظر میں چند ایک ایسی ہی مثالوں کے حوالوں سے ان کے بین السطور میں موجود سماجی اضطراب کی مختلف تہہ داریوں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔کشمیر کی تخلیق کار خواتین ایک حساس سماجی فرد کی حیثیت سے اپنے اطراف بکھرے خونچکاں مناظر، ظلم وبربریت،آلام ومصائب کو کس طرح سے محسوس کیا ہے اور اپنے درد ومزاحمت کو کس طرح ادبی پیرائیہ میں ڈھالا ہے چند مثالیں ملاحظہ کیجیے

☆جی بہت چاہتا ہے رونے کو
اور کیا اب بچا ہے کھونے کو
کھیت کیوں بھر دیے ہیں لاشوں سے
اور کیا کچھ نہیں تھا بونے کو

(رخسانہ جبین)

☆کسی نے باغباں بن کر جلایا مرغزاروں کو
کسی نے سائباں بن کر اجاڑا ہے بہاروں کو
خزاں نے دیکھ ڈالا گھر ترے سب لالہ زاروں کا
نشاط وچشمہ شاہی،ڈل،ولر کا شالماروں کا
سکوں کے ہر خزانے پر ہے پہرا شاہماروں کا
سبھی تیری زمیں پر چاہتے ہیں آسماں اپنا
جڑوں کو گھن لگا کر ٹہنیوں پر آشیاں اپنا

(ترنم ریاض)

☆ نئے ہی رنگ دکھائے ہیں اب کے موسم نے
کہ سبز کھیت جلائے ہیں اب کے موسم نے
نظر میں کیسے بھلاؤں یہ خونچکاں منظر
لہو کے پھول کھلائے ہیں اب کے موسم نے

(نکہت نظر فاروق)

☆ہوائیں خون تشنہ ہو گئی ہیں
فضاؤں میں ہیں پر افشاں پرندے
غضب کی خاموشی ہے وادیوں میں
نشیمن میں ہیں بے ساماں پرندے

(پروین راجہ)

☆میرے شہر کا آسماں /حیران ہے /اس نے کیا نہ دیکھا /جسم کے ٹکڑے /سناٹوں کی گرج /ریت پر بکھرے گیسو /پہاڑ کے دامن میں زخم خوردہ صورتیں /خون کے آبشار/میرے

شہر کا آسماں حیران ہے

(رخشندہ رشید)

☆ سڑک پر کتا /کوڑے کے ڈھیر پہ ایسے بیٹھا ہے /جیسے میں /
زندگی کی راکھ پر / پر وہ سو رہا ہے/ شائد باخبر ہے /
کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا /اس کے پاس /صحن ہوتا ہے نہ چھت /
کرفیو نے شہر کو نگل لیا ہے /بادل کی آنکھ بھر آئی ہے /
میری آنکھ /تیسری منزل سے/ہمسائے کے بڑے صحن میں/
جھانک رہی ہے۔۔/دادا قبر میں /آرام سے سو رہا ہے/
پاس میں جاگیردارن دادی بھی /قدم پسارے ہے /ان کی
ناموجودگی نے/میرے وجود کو کب یتیم کیا/
پتہ نہیں /کرفیو کے سناٹے میں/ شہر کے چھوٹے نکڑ پہ /صحن
تراشتے /میں سوچتی ہوں /کتا سمجھدار ہے

(شبنم عشائی)

☆ قہر ٹوٹا ہے جو اس پر کیا لکھوں
میں زباں رکھتی ہوں کیسے چپ رہوں
کیوں نہ میں بھی اس کی موجوں میں بہوں
کس قدر ہیں دل شکن منظر یہاں
ہر کوئی درد کا پیکر یہاں
ہر قدم پر اک نہ اک ٹھوکر یہاں
پاؤں میں آلام کی زنجیر ہے
روح فرسا کس قدر تصویر ہے
کیا یہی وادی کشمیر ہے

(روبینہ میر)

اگر چہ کہ یہ چند سطور ہیں لیکن ان میں کشمیر کے موجودہ سیاسی وسماجی منظر نامے کو مکمل طور پر نہ صرف دیکھا جا سکتا ہے بلکہ بین السطور میں چھپے شدید درد و کسک کو محسوس کیا جا سکتا ہے نیز شورش زدہ حالات کے خواتین کے ذہن پر مرتب ہونے والے اثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ان اشعار میں استعمال شدہ الفاظ وتشبیہات مثلاً، کھیتوں کا لاشوں سے بھر جانا، کرفیو کا شہر کو نگل جانا، بادل کی آنکھ بھر آنا، مرغزاروں کا جل جانا، خونچکاں منظر، لہو کے پھول، خون کے آبشار، بے ساماں پرندے و پرافشاں پرندے، سناٹوں کی گرج، پاؤں میں آلام کی زنجیر وغیرہ جہاں مضطرب خواتین کے ایک خاص ڈکشن کا پتہ دے رہی ہیں جو خواتین کے اندرونی کرب کا اظہار ہیں۔ وہیں انسانی وجود کے ساتھ ساتھ قدرتی وسائل، تہذیب وثقافت کی تباہی و بربادی پر خواتین کی شدید فکر و ملال کو بھی ظاہر کر رہی ہیں۔ دراصل عورت ہمیشہ قدرتی وسائل و ماحول کی محافظ اور تہذیب وتمدن کے ارتقا میں ایک اہم کیٹیلسٹ کا کردار نبھاتی آئی ہے۔ تاہم جنگ وجدل اور بحران زدہ ماحول میں عورت کا وجود ایک بے مایہ ہستی بنا دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق یہ ضرور بتاتے ہیں کہ ماضی میں عورت کے حصول کے لیے بھی جنگیں ہوئی ہیں لیکن یہ حقیقت بہت کم ہی بیان کی گئی کہ دنیا میں کتنی جنگوں کو روکنے کے لیے بادشاہوں نے زمین وزر کے ساتھ ساتھ اپنی لڑکیوں کو بھی معاہدہ میں دے دیا۔ یعنی بیشتر صورتوں میں خواتین نے جنگ وجدل کو روکنے میں معاون کردار ادا کیا۔ باوجود اس کے آج بھی پرآشوب حالات میں ان کے وجود کی ارزانی اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے۔

خواتین اپنی حساس فطرت کی بنا پر آس پاس رونما ہونے والے دہشت ناک واقعات اور خونریز مناظر کو شدت سے محسوس کرتی ہیں اور مسلسل اضطراب کا شکار رہتی ہیں۔ اضطرابی کیفیت میں مبتلا رہ کر وہ اپنے وجود کو ہی دھیرے دھیرے کھونے لگتی ہیں۔ خوف، ناامیدی و یاس ان کے وجود کا حصّہ بن جاتی ہے۔ نامساعد حالات میں اپنے ادھورے و مسمار ہوتے وجود کے ساتھ ان کی

زندگی یوں ہی گذر تی جاتی ہے۔عورت کے وجود کی اسی ٹوٹ پھوٹ اوراس کے خالی پن کی ترجمانی نسائی ادب میں کس طرح ہوئی ہے چنداشعار دیکھیے ۔

☆ اے زندگی نہ گزرنا ہماری گلیوں سے
ابھی ہمارے جنازے گھروں میں رکھے ہیں
مجھ سے آگے چلتی ہیں مری تنہائیاں
شہر ویرانہ لگے ہے رونقوں کے باوجود

(نسرین نقاش)

☆ بس اتنا کافی ہے اب بھی زمیں ہے زیر قدم
ستارے، شمس وقمر سب بھلا دیے میں نے

(رخسانہ جبین)

☆ لمحہ لمحہ مجھے سولی پہ چڑھانے والو
تم سے میں کس منہ سے جینے کا سہارا مانگوں
شہر کی بھیڑ میں گم ہوگئی میری پہچان
میں ہر آئنہ سے کھویا ہوا چہرہ مانگوں

(نصرت چودھری)

☆ بزمِ وہم وگماں میں رہتی ہوں
ہر گھڑی امتحاں میں رہتی ہوں
رات دن جو ہے برق کی زد پہ
میں بھی کس آشیاں میں رہتی ہوں

(فریدہ کول)

☆ خوشبو ہوں /کہاں چھپ جاؤں / بارود کا غبار مجھے سونگھ رہا ہے /رستوں پر پھیلے /
کنسر ٹینا کے دائرے /مجھے اوڑھ رہے ہیں /سفر حیران ہے /
قدم پریشان /سفر پا پوش کے سینے میں سمار ہا ہے
/قدموں کی دھڑکن/الجھ رہی ہے /کنسر ٹینا کے کانٹوں میں /حسنِ
سکون کی تلاش میں نکلی سانسیں /تھم رہی ہیں /
کنسر ٹینا کے سینے میں /کر فیوزدہ اس بے زبان چوراہہ پہ /
سانسوں سے کہہ دو /کہ چھوڑ دے / میرے من کے ہاتھ
/کوئی انھیں بتادو /کہ مسمار ہوئے وجود کو / نہیں سنوار سکتے /
میرے من کے ہاتھ / کوئی انھیں سمجھادو
/کہ کھوئے ہوئے سکون کو / نہیں تلاش سکتے /میرے من کے ہاتھ / نابینا ہوگئے ہیں /اب کے/میرے من کے ہاتھ

(شبنم عشائی)

☆ نہ جانے/کیا خریدنے چلی تھی /کہیں کچھ بھی ایسا بازار میں نہیں /جو دامن گیر ہوتا /اب/خالی ہاتھ /تماشائی بنی/
ہر بازار سے گذر جاؤنگی

(شبنم عشائی)

☆ گولیوں کا سایہ ہے / بارودی سرنگیں ہیں /سوچ کے تعاقب میں / دوڑنے کی خواہش پر / رینگتا ہے چھپ چھپ کر /وش بھرا سے کا سانپ

(ترنم ریاض)

متذکرہ بالا اشعار کے حوالے سے خواتین کی اضطرابی کیفیت کا بھرپور اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ کیفیات وبے سکونیاں دراصل سماج کی نصف آبادی یعنی خواتین کی روز مرہ زندگی کی ترجمان ہیں۔ کسی بھی سماج کا ایک بڑا طبقہ جب انتشار کا یوں شکار ہوجاتا ہے تب یہ سوال ابھرآتا ہے کہ اس سماج کی ترقی کیوں کر ممکن ہوگی؟ کیا اس سماج کی گود سے ایک صحت مند نسل جنم لے گی؟ ایک بہتر سماجی نظام کی تشکیل صحت مند جسم وذہن کے مالک عورت ومرد کی موجودگی اور تمام شعبہ حیات میں مساویانہ حصّہ داری سے ہی ممکن ہوتی ہے ۔ باوقار وآسودہ حال انسانی زندگی کے لیے تمام بنیادی ضروریات کی تکمیل اور حقوق کی فراہمی ناگزیر ہوتی ہے

۔لیکن بالا دستی،ظلم و جبر کے نتیجے میں جب سماجی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے تب ایک ایسا سماج وجود میں آجاتا ہے جس میں مختلف طرح کے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں ۔خواتین کی نسبت سے یہ مسائل اور بھی پیچیدہ وسنگین ہو جاتے ہیں ۔یہی صورتِ حال کشمیر کے سماج کی ہے۔معاصر نسائی ادب کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر تخلیقات میں خواتین کے تعلیمی ،سماجی ،معاشی اور صحتی ونفسیاتی مسائل کی بہتر طور پر عکاسی کی گئی ہے۔ بالخصوص فکشن میں ان مسائل کو زیادہ تر موضوع بحث بنایا گیا اور کئی ایک بہترین افسانے و ناول لکھے گئے جبکہ شعری حصّہ دردوکرب،جذبات واحساسات کے اظہار سے پُرنظر آتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سماج میں انتشار و عدم استحکام کی وجہ سے معیشت تباہ و تاراج ہو جاتی ہے اور غربت وہاں کے افراد کی زندگیوں کا حصّہ بن جاتی ہے۔معیشت کی تباہی اور غربت کے باعث انسانی زندگی کی اسی کشمکش کو نکہت فاروق نظر نے اپنے افسانے ''قہر نیلے آسمان کا'' میں بڑے موثر طریقے سے پیش کیا ہے ۔قالین کی بنائی کشمیر کے عوام کی معیشت کا ایک اہم ذریعہ رہی ہے۔نکہت فاروق نظر نے اس افسانہ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ قالین کی بنائی کے ساتھ ساتھ کس طرح سے غریب خاندان کی ضروریات کی تکمیل اور ایک اچھی زندگی کے سپنے بھی بنتے چلے جاتے ہیں۔قالین تیار ہوجاتا ہے ۔سپنوں کو حقیقت میں بدلنے کا وقت قریب ہوتا ہے کہ شہر میں حالات بگڑ جاتے ہیں فائرنگ ہوتی ہے اور پوری بستی جل اُٹھتی ہے ۔ایسے میں غریب خاندان اپنے اور اپنے بچوں کے بچاؤ سے زیادہ مسلسل اس الجھن میں گرفتار رہتے ہیں کہ کہیں قالین جل نہ جائے اور کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ قالین کو بہ حفاظت باہر نکالا جائے کیونکہ ان کی زندگی کی بقا تو اسی قالین میں مضمر ہے۔لیکن ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود قالین جل جاتا ہے اور پھر سے غربت ان کی زندگی کا حصّہ بن جاتی ہے ۔اسی طرح ترنم ریاض نے اپنے افسانے ''برف گرنے والی ہے'' میں کسمپرسی سے جوجتے خاندان کی تصویر کشی کی ہے ۔انھوں نے اپنے افسانے میں غربت کی گود سے جنم لیتے مختلف مسائل کو پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان پریشان کن حالات میں نوجوان نسل کئی ایک غیر قانونی کام کرنے پر مجبور ہورہی ہے تا کہ کسی بھی طرح سے زندگی کی ضروریات کی تکمیل کی جا سکے ۔اس ضمن میں افسانہ کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''جب تک جان ہے بھوک لگے گی نہ ماں۔تمہیں لگی ہے مجھے بھی لگی ہے۔۔۔میں جلدی آؤنگا۔تم فکر مت کرنا۔

جب میں آؤنگا تو گھر کا سارا سامان لے کر آؤنگا۔

مجھے آنے میں دیر ہوئی تو تم گھبرا مت جانا''۔

ایسے ہی ایک موضوع پر ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کا افسانچہ ''تھیلا'' ملاحظہ کیجیے

''یہ اتنے پیسے تجھے کہاں سے ملے؟

''ایک آدمی آیا اور اس نے ایک تھیلا بیچ بازار میں رکھنے کو دیا''

''کیا تم نے رکھ دیا''

''ہاں اسی کے تو دوسو روپے ملے۔اب ماں کے لیے دوائی لاسکتا ہوں''

''مجھے بھی دکھاؤ۔وہ تھیلے کہاں سے ملتے ہیں۔مجھے اپنے بابا کے لیے کھانا لانا ہے۔''

اسی طرح زنفر کھوکر نے اپنے افسانے ''دوحکمراں'' میں بیوہ کے معاشی مسائل کو پیش کیا ہے اور علامتی انداز میں ان اسباب کی بھی نشاندہی بھی کی ہے جو ان شورش زدہ حالات کو پیدا کرنیوالے ہیں۔ایک بیوہ جو بدترین معاشی حالات کے نتیجے میں پیسے مانگنے پر

مجبور ہوجاتی ہے اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تب وہ کیا جواب دیتی ہے ملاحظہ کیجیے

''ہاں میں رہنے والی ہوں اس سلطنت کی' جس میں اکثریت ہے بیواؤں کی اور یتیم بچوں کی۔جس کے حاکم ہیں دو۔

ایک کی حکومت چلتی ہے دن کے اجالے میں اور دوسرے کی رات کے اندھیرے میں۔دفاتر، مجلسیں اور عدالتیں لگتی ہیں دن کو اور رات کو بھی۔لین دین ،کاروبار اور دیگر معاملات طے پاتے ہیں دن کو بھی اور رات کو بھی۔مگر ان سب کے باوجود سلطنت دن دگنی اور رات چوگنی انتشار کا شکار ہے اور بد حالی کی طرف گامزن ہے۔ایک اندازے کے مطابق دوحکمرانوں والی اس سلطنت کے اسّی فیصد سے زائد باشندے مالی،جسمانی اور ذہنی طور پر بدحال،اپاہج اور مفلس ہوچکے ہیں۔۔۔۔۔۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھادیا''

(اقتباس افسانہ۔ دوحکمران)

پچھلے کئی برسوں سے کشمیر کے نامساعد حالات میں' کم عمر لڑکوں،نوجوان و بوڑھوں کی اموات کا پتہ نہ چلنا یا برسوں تک ان کا لاپتہ ہوجانا نہایت سنگین انسانی مسئلہ بن کر ابھرا ہے۔اسی مسئلہ کے تناظر میں ''نیم بیوہ یا نیم ماں یا نیم یتیم'' کی اصطلاحات بھی وجود میں آگئی ہیں۔سینکڑوں خواتین ایسی ہیں جو اپنوں کے واپس لوٹ آنے کے طویل انتظار میں ہر دن موت کے کرب سے گذرتی ہیں یا اپنے گمشدہ رشتوں کی تلاش میں ہوش وخرد سے بے گانہ ہو جاتی ہیں۔اس مسئلہ پر کی گئی تحقیق کے مطابق ''مرد حضرات کے غائب ہونے کی وجہ سے نیم بیوہ کی تعداد روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ایسی خواتین معاشی مسائل کا شکار تو ہو ہی رہی ہیں لیکن انھیں سماجی عدم تحفظ کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے۔ان کے شوہروں کے متعلق سماج میں ایک منفی نظریہ قائم ہوجاتا ہے۔انھیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔جس کا راست طور پر اثر ان کی ذہنی حالت پر پڑتا ہے۔ان میں بیشتر خواتین کم تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر کمزور گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔زندگی کی بقا اور اپنے بچوں کو پالنے پوسنے کے لیے انھیں روزانہ اجرت یا معمولی کاموں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔انھیں کئی ایک صنفی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔وہ کوئی قانونی مدد بھی حاصل نہیں کرسکتیں۔لہذا انھیں زندگی کی لڑائی اکیلے لڑنی پڑتی ہے۔جس کے نتیجے میں وہ سماج سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان کا وجود کہیں مخفی ہوجاتا ہے'' (۴) گھر کے ذمہ داران یا مرد افراد کی گمشدگی کے مسئلہ کو خواتین نے اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ایک نیم بیوہ کے کرب کو شاعرہ رموز نے کس طرح الفاظ کا جامعہ پہنایا ہے ملاحظہ کیجیے

☆کوئی تو شور کے بازار میں لفظ بچاؤ
کوئی تو خاموشی کا احتجاج درج کراؤ
☆آجاؤ میرا انتظار ابھی تھکا نہیں
آبھی جاؤ کہ یوسف ابھی بکا نہیں
☆آجاؤ کہ غیرت کبھی بھی ساتھ چھوڑ دے گی
آبھی جاؤ کہ حیرت کبھی تو نیند توڑ دے گی

ترنم ریاض کے افسانے ''مٹی'' سے اس ماں کے کرب کی جھلک ملاحظہ کیجیے جس نے اپنا جوان بیٹا کھودیا ہے ۔اقتباس پیش ہے۔

''ہلال احمد کی ماں دن بھر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سڑک پر نکل آتی ہے۔جینز ٹی شرٹ پہنے کسی لڑکے کو بغور دیکھتی ہے۔۔۔۔

پھر۔۔۔ہلال احمد کے متعلق پوچھتی ہے۔پھر مایوس ہوکر رو پڑتی ہے۔کسی اور طرف چل دیتی ہے۔اپنی طرح کی کئی عورتوں سے

اس کی پہچان ہوگئی ہے۔کسی کا لڑکا غائب ہے۔کسی کا شوہر۔کسی کا بچّہ دل کا مریض ہوگیا ہے۔کسی کی بیٹی گونگی ہوگئی ہے۔

ہلال احمد بھی غائب ہے۔پتہ نہیں اس کی ماں اسے

کب دیکھے گی۔دیکھے گی بھی یا۔۔۔'' (افسانہ مٹی)

کشمیر کے پرآشوب حالات میں جنسی استحصال یا جنسی تشدد روزانہ کا معمول بنتا جارہا ہے۔خواتین کا وقار پوری طرح مجروح ہوکر رہ گیا ہے۔اس طرح کے بڑھتے واقعات کے نتیجے میں خواتین مسلسل خوف ودہشت کے عالم میں جی رہی ہیں۔نیشنل فیملی ہیلت سروے رپورٹ کے مطابق کشمیر میں مردوں کے مقابلے خواتین کی زیادہ تعداد ڈیپریشن،زندگی سے عدم دلچسپی،خوف وبے خوابی کا شکار ہیں۔اس کی بنیادی وجہ کشمیر کا وہ ماحول ہے جس میں خواتین عدم تحفظ کا شکار ہیں۔اس ریاست میں جاری جنسی تشدد کو انسانی حقوق کی پامالی کی بدترین مثال قرار دیا گیا ہے۔عاصمہ حسن اور انیسہ شفیع نے کشمیر میں خواتین کی ذہنی صحت کے متعلق جاننے کے لیے متاثرہ علاقہ کے۲۰۰ گھروں کا سروے کیا۔ان کی تحقیق سے پتہ چلا کہ ۲۰۰ گھرانوں میں کل ۱۰۹ افراد کی موت واقع ہوئی۔نمونہ میں ۸۲ مائیں ایسی تھیں جن کے بچے مارے گئے یا غائب ہوگئے۔حاصل شدہ نمونے(سیمپل) میں ۳۹ نو بیاہتا عورتیں (بیویاں)تھیں۔یہ تمام خواتین نفسیاتی طور پر متاثر پائی گئیں۔صحتی یا نفسیاتی مسائل میں سب سے زیادہ شرح یعنی ۹۰ فیصد خواتین خوف کا شکار پائی گئیں۔دوسرے نمبر پر ڈیپریشن پایا گیا۔دیگر بیماریوں میں نیند کی کمی اور زندگی سے عدم دلچسپی بتائی گئی۔(۵) دوسری تحقیقی رپورٹ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ کشمیر میں چونکہ عورتوں کو جنسی ہراسانی یا استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی لیے مردوں کے مقابلے خواتین کی زیادہ تعداد نفسیاتی طور پر متاثر ہے۔ڈیپریشن کا شکار خواتین 60 فیصد ہیں جبکہ مردوں میں یہ شرح 51 فیصد ہے۔خواتین کے ہر عمر کے گروپ میں یہ شرح پائی گئی جبکہ 35-26 برس کی عمر کے دوران 68.66 پائی گئی۔(۶) خاتون تخلیق کاروں نے اس کربناک حقیقت کو صفحہ قرطاس پر کس درد سے اتارا ہے ملاحظہ کیجیے۔

☆''شام کو جب مشتاکہ اور مجید کام سے لوٹے تو دلّو بے

ہوش پڑی تھی اس کی گردن پر خراشیں تھیں اور چہرے پر نیلے

دھبے ابھر آئے تھے اور ماں نے اپنے بہت سارے بال

نوچ ڈالے تھے۔اس دن ماں کچھ بولی نہیں تھی۔دوسرے

دن سینیر اسکول کے ماسٹر جی کو گولیاں لگنے کی بات سن

کر ماں نے بتایا تھا کہ باپ اور بھائی کو بار بار پکارنے کے بعد

دلّو نے ماسٹر جی ماسٹر جی کہا تھا اور پھر بے ہوش ہوگئی تھی''

(ترنم ریاض،افسانہ کشتی)

☆''وردی پوش نے لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا

اور پھر دھکا دے دیا۔وہ دھڑام سے گری۔۔۔۔مجمع سن ہوگیا

بچے کانپ رہے تھے۔۔۔۔۔۔لڑکیاں اپنے

رشتہ داروں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کررہی تھیں۔''

(ترنم ریاض،افسانہ مٹی)

☆ کیا لکھوں /میں کیا لکھوں /کچھ سوجھتا نہیں/من

زخم زخم ہے /اور شعر پرہے سکوت /قلم /روشنائی میں نہیں

/اس نیل میں ڈوبے بار بار /جو آصفہ /کے ہونٹوں پر پڑے

ہوئے تھے /صفحوں پر /طرح طرح کے نیل پڑے ہوئے ہیں

/وحشت رنگ کے /اور /چرچے یہ بیٹی بچاؤ کے /چلو بیٹیوں /

اپنی قبر پر/فاتحہ پڑھ لیں

(شبنم عشائی)

☆یہ زندگی بھی عجب رہگذر لگے ہے مجھے

کہ ہر مقام پہ لٹنے کا ڈر لگے ہے مجھے

جہاں بھی دیکھوں وہیں رک کے تکنے لگتی ہوں
کہ ہرا جاڑ کھنڈرا اپنا گھر لگے ہے مجھے

(نسرین نقاش)

کشمیر میں خواتین کو بدترین حالات کے علاوہ اندرونِ خانہ و بیرونِ خانہ صنفی مسائل سے بھی جوجنا پڑتا ہے۔ان کے اضطراب کا ایک سبب ان کے ساتھ روا رکھا جانے والا صنفی تشدد یا وہ صنفی تفرقات ہیں جس سے بے شمار خواتین روزمرہ زندگی میں متاثر ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی پدرسری معاشرہ میں عورت کے ساتھ غیر انسانی سلوک برتا جاتا رہا ہے۔عورت پر کنٹرول قائم کرنے، اسے محکوم و بے اختیار بنائے رکھنے کے لیے نہ صرف جنسی تشدد و استحصال کو ذریعہ بنایا جاتا رہا ہے بلکہ مختلف قسم کے صنفی تشدد کو بھی روایات و رسومات کا حصّہ بنا دیا گیا۔ یہ بھی دراصل اسی پدرسری نظام کے کنٹرول کی توسیع ہوتی ہے۔جس کی سب سے بڑی مثال گھریلو سطح پر عورت پر ڈھایا جانے والا ظلم و تشدد، جہیز کے مطالبات یا طلاق و خلع کے معاملات ہیں۔سماج میں عورت کے وجود کے ساتھ کئی ایک تصورات و نظریات کو جوڑ لیا گیا اور صدیوں سے ان ہی نظریات کے تحت اس کی زندگی بنائی و مٹائی جاتی رہی۔تمام شعبہ ہائے حیات میں رائج صنفی تفرقے عورت کو ترقی کے دھارے سے بہت دور لے آتے ہیں۔کشمیر میں کیے گئے مختلف سرویز اور ریکارڈز سے پتہ چلتا ہے کہ سیاسی، سماجی و معاشی بحران کے نتیجے میں صنفی تشدد یا امتیازی رویوں میں مزید اضافہ ہوا ہے۔جس کے نتیجے میں سماجی، معاشی اور سیاسی سطحوں پر خواتین کی شمولیت کم ہوتی جا رہی ہے۔شہری علاقوں کی بہ نسبت دیہی علاقوں میں گھریلو تشدد کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔(۷)

سماج میں عورت کا وجود بہ حیثیت انسان کے جہاں اپنی کوئی ہستی نہیں رکھتا وہیں ماں، بہن، بیوی، بیٹی کی حیثیت سے انسانی زندگی کی بقاء وارتقاء میں اہم کردار ادا کرنے کے باوجود سماج میں اس کا وجود بیکار سمجھا جاتا ہے۔تاہم آج کی عورت جہاں صنفی تفرقات کے نظریات سے متاثر ہے وہیں ان فرسودہ نظریات کو بدلنے کی کسی حد تک سعی بھی کر رہی ہے۔اگرچہ کہ حقوقِ نسواں کے متعلق ہندوستان میں اٹھنے والی ہر آواز کو مغربی ممالک کی دین یا ’’ویسٹرن فیمینیزم‘‘ کا نام دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جبکہ ہندوستانی خواتین اپنے اپنے سماجی و ثقافتی ماحول کے تناظر میں ہونے والے جبر و استحصال کے متعلق لکھتی ہیں اور اپنی مزاحمت درج کرواتی آئی ہیں۔ جسے ہندوستان کے سماجی پس منظر میں ہی سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔کشمیر کے نسائی ادب میں بھی ہمیں صنفی مباحث یا اضطراب کے یہ دونوں رنگ کہیں ہلکے تو کہیں گہرے نظر آتے ہیں۔صنفی تشدد یا امتیازات کے رویوں اور خواتین پر ان کے اثرات کو نثر اور نظم کے حوالے سے معاصر نسائی ادب میں خوب موضوع بنایا گیا ہے۔تاہم یہاں چند نظموں کے حوالے سے سماج کے صنفی نظریات، خواتین پر ان کے اثرات اور تخلیق کار خواتین کی مزاحمت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔صنفی تعصّبات اور استحصال کے مختلف زاویوں کو خواتین نے اپنی نظموں میں کس طرح سے پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیے

☆ لڑکی /جب اپنی تلاش میں نکلتی ہے /اپنے دکھ خود بھوگتی ہے /اپنے خواب خود بنتی ہے /تو منافق /اس کا مقدر /غیبتوں سے بنتے ہیں /خدا بھی مداخلت نہیں کرتا/ یہ حیرانگی /لڑکی کو فالج زدہ کرتی ہے /اور وہ اپنی تلاش کھو بیٹھتی ہے

(شبنم عشائی)

☆ میری لکنت /اس قلم کی زبان ہے /جس کو تمہاری انا

نے تراشا /اور یہ گونج ہے /میرے وجود کے /ٹوٹنے کی آواز ہے
/کوئی feminism نہیں /بس /بے حیثیتی ہے۔
(شبنم عشائی)

☆ مانا کہ /تم /جو کہہ رہی ہو /وہ صحیح ہے /مگر
۔۔۔ /تم /کچھ کر تو نہیں سکتیں /کیوں کہ۔۔۔ /تم /ایک لڑکی
ہو /لڑکی (نظم لڑکی، روبینہ میر)

☆ افسوس۔۔۔/ مجھے زندگی بھر /مر مر کے
جینا ہے /اس لفظ کے ڈر سے / یہ لفظ ہر روز / مجھے نئی موت
مارتا ہے /نہ جانے کب کہاں /تم مجھ سے کہہ دو / ''طلاق
۔۔۔طلاق۔۔۔طلاق''

(نظم طلاق سے اقتباس، روبینہ میر)

☆تم کہتے ہو نصف کبھی پورا نہیں ہو سکتا /
ذرا آج تم غور سے دیکھو /میرے وجود کے ست رنگی پہلو کو
/میں تو اگھنتار پیڑ کی مانند /گھنا سایہ اور
بھری شاخیں لیے /اپنی جگہ بھرپور ہوں /کہیں ماں ہوں کہیں بہن
/کہیں بیوی تو کہیں بیٹی /ملا ہے کہیں دیوی کا درجہ /کہیں
بنی بازار کی رونق /کبھی کسی مجنوں کی لیلیٰ /تم کہتے ہو کہ میرے
پیروں تلے جنت ہے /کیا؟ /یہ ست رنگی شخصیت لے کر بھی /
ادھوری ہوں /نصف ہوں /اپنے آپ کو ''پورا'' کہنے والے /تم
کیسے پورے ہو سکتے ہو /جب کہ تم ایک ''نصف'' سے جنمے ہو
(نظم۔کڑواسچ، نکہت فاروق نظر)

الغرض کشمیر کے حوالے سے معاصر نسائی ادب کے جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ خاتون قلم کاروں کی تخلیقات میں عصری حسّیت و آگہی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انھوں نے بہ حیثیت ایک حساس فرد کے اپنے اطراف و اکناف میں بکھرے سماجی بحران کو شدت سے محسوس کیا اور اس کے نتیجے میں خواتین پر مرتب ہونے والے اثرات اور اضطراب کا بھرپور اظہار کیا۔ خاتون قلم کاروں نے شورش زدہ ماحول میں روز افزوں بڑھتے سماجی و معاشی، صحتی ونفسیاتی مسائل کے علاوہ انسانی حقوق کی پامالی، جنسی و صنفی تشدد و استحصال کی اندوہناک داستانیں بھی رقم کر دیں۔ گویا خواتین نے ایک ایسی معاشرتی تاریخ رقم کر دی جس کے حوالے سے عدم استحکام سے متاثر عورت کے مکمل وجود کو سمجھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے مطابق

''کسی ادیب یا شاعر کے ہاں اگر حسّیت اور عصری آگہی کے اوصاف موجود ہوں تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جو فن وہ تخلیق کرے گا اس فن میں معاشرہ سانس لیتا نظر آئے گا۔'' (۸)

اس نظریہ پر کشمیر کے عصری نسائی ادب کو پرکھیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سرمایہ ادب میں عدم استحکام کی مکمل صورتِ حال، اور بحران زدہ ماحول میں گذرنے والی خواتین کی زندگی کے تمام پہلو اپنے پوری حقیقتوں کے ساتھ متحرک و سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ کہ سماجی حالات و اضطراب کی عکاسی کا پہلو کسی تخلیق کار کے ہاں بلند آہنگی کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے تو کسی کے ہاں ان کے سر دھیمے دھیمے سنائی پڑتے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر ان تخلیقات کو مختلف زاویوں سے مطالعہ کا حصّہ بنایا جا سکتا ہے۔

عورت کا شکستہ وجود، تنہائی، اداسی، بے بسی، زندگی سے مایوسی، رشتوں کو کھونے کا درد، گمشدہ افراد کے لوٹ آنے کے انتظار کا کرب، غیر انسانی برتاؤ کا خوف، سماجی رویے، ذہنی و جذباتی ہیجان، فطرت اور ثقافت کے برباد ہونے کا غم، اندرونِ ذات پیدا ہونے اضطراب کی یہ وہ مختلف کیفیات ہیں جو معاصر نسائی ادب کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں۔ یہ ادبی سرمایہ صرف موضوع، اسلوب یا عصری آگہی ونسائی شعور کے اعتبار سے ہی اہم نہیں ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ ان میں تاریخ،

سماجیات،نفسیات،معاشیات،ماحولیات اور انسانی حقوق وخواتین کے حقوق کی پائمالی کے متعلق وہ تلخ حقائق محفوظ ہو گئے ہیں جن کے مطالعہ کے بغیر ہندوستان میں خواتین کے موقف یا اندرونِ خانہ و بیرونِ خانہ ان کے مسائل کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور نہ بہ حیثیت انسان عورت کے شکستہ وجود کو سمجھا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ صرف ادب پارے نہیں ہیں بلکہ سیاسی ،سماجی وثقافتی جبر واستحصال کے خلاف مزاحمت کا اظہار ہیں بلکہ وہ مضطرب صدائیں ہیں جنھیں سننا ناگزیر ہے۔تا کہ انسانی حقوق کی بنیاد پر انھیں مرکزی دھارے میں لاکر خصوصی توجہ مرکوز کی جا سکے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر مطالعاتِ نسواں کا حصّہ بنایا جا سکے۔

OOO

ماخذات(آن لائن وآف لائن مطبوعات)

1. (a)UN High Comission for Human Rights ,Kashmir Report, June 2018

(b)Amnesty International India Report, 2017-18

(c) Kazi Seema . Between Democracy and nation: Gender and militarization in Kashmir, Women unlimited ,New Delhi, 2009

(d)Maqbool.Oufee,()2017), "Impact of Conflict on Women in Kashmir" , Academic Research Journal, Volume .5 (3)

(e) Farooq A.Rather(2013) ,Armed Conflicts in J & K and its Imact on Sciety : A Case Study of Kashmir Valley" , International journal of Scientific and Research Journal,Volume 3,Issue 2

2.Qutub. Soudiya , Women Victims of Armed conflict -Half Widows in J&K, JSTOR,Indian Sociological Society ,May -Aug 2012

3۔ ریاض پنجابی (پروفیسر)، پیش لفظ ''اجنبی جزیروں میں'' از ڈاکٹر ترنم ریاض

4.Gul.Showkeen Bilal Ahmad, Women and Violence: A study of Women's Empowerment and its challenges in J & K,Review of Literature,volume 2 issue 7.Feb 2015

5.Hassan.Asima , Shafi Aneesa , Impact of Conflict Situation on mental Health in Srinagar, E journal of Sociology .volume 10 Number 1.January 2013

6.Amin Syed and Khan .A W, July2009. Life in Confilct:-Characterstics of Depression in Kashmir,International journal of health sciences

7. Gul.Showkeen Bilal Ahmad, Women and Violence: A study of Women's Empowerment and its challenges in J & K,Review of Literature,volume 2 issue (7.Feb 2015

8۔جگن ناتھ آزاد(پروفیسر) اقتباس،مشمولہ ماہنامہ شاعر، مارچ ۲۰۱۴ ،ص ۷۶)

نامور سنگھ ارغبت شمیم ملک

مضمون

قومی تحریکِ آزادی اور پریم چند

پٹنہ کے پریم چند جنم صدی پروگرام کمیٹی کے عہدہ داران اور ارکان کا میں تہہِ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے اِس موقع پر یہاں میموریل لکچر کے لئے مدعو کیا۔ کھگندر جی نے ابتدا میں ہی اِس کانفرنس کے پس منظر اور اِس کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور کچھ تاسف کا بھی اظہار کیا ہے کہ ایک غیر ہندی زبان کی ریاستی حکومت نے پریم چند جنم صدی کے لئے ایک پروگرام کا انعقاد کیا اور ہندی زبان کی ریاستی حکومتیں اِس سمت میں کوئی بھی قدم نہیں اُٹھا سکیں۔ کھگندر جیسے پُر جوش ادیب ایسی صورتِ حال پر اظہارِ افسوس کریں تو اِس پر ہمیں بھی اور آپ کو بھی افسوس ہونا چاہیے۔ اِس میں نہ کوئی تعجب کی بات ہے اور نہ دکھ کی۔ مغربی بنگال کے بایاں محاذ کی حکومت اگر پریم چند کے لئے کچھ کرتی ہے، تو مناسب ہی ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی حکومت اگر پریم چند کو یاد نہیں کرے گی تو کون کرے گی؟ جہاں تک دوسری حکومتوں کا سوال ہے۔ اُن کے بارے میں اس وقت کچھ کہنا غالباً نامناسب اور غیر ضروری ہے جو ہے نہیں اُس کی بحث فضول ہے! لیکن اگر کوئی بات ہوتی بھی تو پریم چند کی شخصیت اور فن کو دیکھتے ہوئے ہر طرح سے ٹھیک ہی ہوتا ہر ادیب چاہتا ہے کہ عوام میں اس کی عزت ہو۔ عوامی ادیب کی حیثیت سے اس کا وقار قائم ہو۔ جن کا ادیب وہ نہیں ہے جن کے مفادات کا تحفظ وہ نہیں کرتا، وہ اگر اُس کو نظر انداز کرتے ہیں تو یہ اُس ادیب کا اعزاز ہے، اُس کی اہمیت ہے۔ افسوس اس وقت ہوگا جب ہندی کے ادبی عاشق پریم چند کو بھول جائیں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے کہ اہل ہندی ابھی خود فراموشی کے خندق میں گرے نہیں ہیں بلکہ پریم چند کی شخصیت اور ادب کو یاد کر رہے ہیں جس کا زندہ ثبوت یہ پروگرام یہ سیمینار ہے۔

آپ کے سامنے پریم چند کے جس پہلو کے بارے میں اظہار خیال کے لئے مجھے آج کہا گیا ہے وہ ہے ''قومی تحریکِ آزادی اور پریم چند'' ہم لوگ اُسے ''جنگِ آزادی اور پریم چند'' کہتے ہیں۔ پریم چند کے ادب سے جو لوگ تھوڑا بہت بھی واقف ہیں، وہ چاہے اور کچھ نہ جانتے ہوں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ پریم چند ہماری جنگِ آزادی کے انوکھے اور عظیم کہانی کار تھے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اِس میدان میں پریم چند پورے ہندوستانی ادب میں اپنا بے نظیر مقام رکھتے ہیں۔ 1905-1906ء کے بنگ بھنگ سے لے کر 1936 تک، جب پریم چند کی موت ہوئی۔ اِن برسوں کی ہندوستانی زندگی کی دھڑکن، اس کی جدوجہد، اُس کی شکست، اُس کا دکھ، اُس کا درد، اپنی پوری گہرائی کے ساتھ اور اپنی پوری وضاحت کے ساتھ اگر کسی ایک ہندوستانی ادیب کے یہاں آپ تلاش کرنا چاہیں، تو رابندر ناتھ ٹیگور، شرت چندر، سبرمنیہ بھارتی، وی ایس کھانڈیکر کے ہوتے ہوئے بھی میں پریم چند کا نام سب سے لینا چاہوں گا کیوں کہ یہی وہ واحد ادیب ہیں جن کے ادب میں جنگِ آزادی کی داستان پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوتی ہے۔ میں کہنا چاہوں گا کہ ان تیس برسوں میں ہندوستانی جنگِ آزادی کی داستان پوری تفصیل کے ساتھ اگر کسی ایک ادیب کے ادب میں آپ دیکھنا چاہیں، تو پریم چند کے ادب میں دیکھیں۔ یہ بالکل واضح بات ہے پھر بھی اکثر آنکھوں سے اوجھل ہو جایا کرتی ہے۔ کبھی کبھی جو بات جتنی زیادہ واضح ہوتی ہے، وہی

آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔اسی لئے پریم چند کی اہمیت کے بارے میں غوروفکر کرتے ہوئے اِس چھوٹی سی حقیقت کو ہمیشہ دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ 1936 میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کے اولین کانفرنس میں صدر کی حیثیت سے پریم چند نے بہت سی اہم باتیں کہی تھیں۔اُن میں ایک بات آج خصوصاً اِس سیاق میں قابلِ ذکر ہے۔ادب کی اہمیت کے بارے میں اُنھوں نے کہا تھا کہ ''ادب سیاست کے آگے مشعل لے کر چلنے والی سچائی ہے۔'' قومی تحریکِ آزادی کے سیاق میں پریم چند کے اس قول کی خاص اہمیت ہے۔عموماً سیاست دانوں کا یہ دعویٰ ہے اور جو ہندوستانی سیاست کی تاریخ لکھتے ہیں، وہ دکھاتے بھی ہیں کہ تحریکِ آزادی میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہرلعل نہرو یا دوسرے سیاست داں، رہنماؤں نے ملک میں جیسے خیالات کی دھوم مچائی، اور اپنے کاموں کے توسط سے جس طرح کا سیاسی ماحول بنایا، ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں نے ان کی پیروی کرتے ہوئے اُنھیں خیالات اور اُنھیں جذبات کی ترجمانی اپنے ادب میں کی۔لیکن میں اس مختصر سے لکچر میں آپ کے سامنے چند حقائق کی بنیاد پر یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ موضوعی صورتِ حال کچھ اور ہی ہے۔ادیب ہمیشہ سیاست کے پیچھے چلنے والا ہی نہیں ہوتا ہے ۔کبھی کبھی قدم ملا کے آگے بھی قدم رکھتا ہے کیوں کہ اُس کا گہرا رشتہ اُس عوام سے ہوتا ہے، اُس عوامی گروہ سے ہوتا ہے جو عوامی اور سیاسی جدوجہد میں کبھی کبھی اپنے رہنماؤں سے آگے بھی نکل جاتا ہے۔پریم چند کا ادب اِس نقطۂ نظر سے بھی خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

پریم چند کے ادب کو ہم لوگ سیاسی رہنماؤں اور کچھ اہم مفکروں کے خیالات کے ترجمان کے طور پر دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔پریم چند کا پورا ادب اگر دیکھا جائے اور جس ترتیب سے اُس کا ارتقا ہوا ہے۔اُس پر اگر غور کیا جائے، تو اُس کی کئی جہتیں کھل کر سامنے آئے گی۔عموماً لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور کبھی کبھی کتابوں میں بھی یہ اظہارِ خیال کیا جاتا ہے کہ ادیب کی شخصیت کو یا تخلیق کو حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا جانا چاہیے۔عموماً 1907 سے لے کر 32-1930 تک پریم چند چند کا ادب یکساں طور پر چلتاا ہے۔1920 تا 32-1930 دوسرا دور چلتا ہے اور جو آخری دور ہے وہ 32-1930 تا 1936 تک چلتا ہے۔اُن کے ادب میں ہماری قومی تحریکِ آزادی یا جنگِ آزادی کی مختلف جہتیں کس طرح ترتیب سے آتی ہیں، آپ اسے دیکھیں گے۔

اگرچہ ہماری جنگِ آزادی کی تاریخ بہت پے چیدہ ہے، پھر بھی اکثر اسے آسان کر کے دکھایا جاتا ہے کبھی کبھی صرف کانگریس کی تاریخ کو ہی ہماری آزادی کی جنگ کی تاریخ کہہ دیا جاتا ہے۔اِس جنگِ آزادی میں بہت پیچ وخم تھے، پے چیدگیاں تھیں، کشمکش تھی۔اس میں کئی تصورات کئی سمتوں سے آ کے ملتی تھیں، باہم ٹکراتی تھیں۔لیکن پریم چند کے ادب میں یہ باتیں کس طرح ابھری تھیں۔اُسے دیکھنے پر ہمیں معلوم ہوگا کہ صرف کانگریس کی تاریخ جنگِ آزادی کی تاریخ نہیں ہے اور پریم چند کا ادب صرف کانگریس کی رہنمائی میں چلنے والی جدوجہد کی تاریخ نہیں ہے۔

آپ کو پتہ ہوگا پریم چند کی پہلی باضابطہ کہانی جدنیا کا سب سے انمول رتن ہے اور جس کا ادبی تاریخ میں اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔کئی طرح سے دلچسپ کہانی ہے۔کہانی میں ایک معشوقہ اپنے عاشق سے کہتی ہے کہ میں اپنا پیار تمھیں اس وقت دوں گی، جب تم مجھے دنیا کا سب سے انمول رتن لا کے دو گے۔یہاں کہانی اُس قصہ گوئی کے انداز میں چلتی ہے جس انداز میں فارسی کہانی چلا کرتی

تھیں۔کوئی معشوقہ،کوئی بیگم،کوئی معشوقہ اپنے عاشق سے ایسی ہی انوکھی اور بیش قیمت چیز مانگتی تھی جس کا ملنا بہت مشکل ہو۔اور جب تک اُسے وہ لا نہ دے،تب تک وہ اُسے اپنا پیار نہیں دیتی تھی۔کہانی شروع ہوتی ہے اور پرانے طرز پر چلتی ہے لیکن جب عاشق لوٹتا ہے تو وہ تین چیزیں لے کر لوٹتا ہے،ایک پھانسی کے تختے پر چڑھے ہوئے آدمی کے آنسو،دوسرا اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ جل جانے والی بیوی کی راکھ اور تیسرا شہید ہو جانے والے راجپوت کے خون کی ایک بوند۔یہی تین چیزیں پریم چند کی نظر میں دنیا کا سب سے انمول رتن ہیں۔یہ بات خاطرِ نشان رہے کہ کہانی کا ڈھانچہ تو فارسی کی پرانی کہانیوں کے انداز کی طرح ہی تھا لیکن جو انمول رتن اُنھوں نے چنے تھے،وہ نئے تھے۔یہ تینوں چیزیں پھانسی کے تختے پر چڑھے ہوئے آدمی کے آنسو،چتا کی راکھ اور شہید کے خون کی ایک بوند۔یہ نئے انداز اور نئے جذبات کے استعارے ہیں اسے آپ ’مثالیت پسندی‘ کہہ سکتے ہیں۔لیکن اس طرح پریم چند اپنی کہانیوں میں نئی حب الوطنی اور نئے قومی جذبہ کو پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہماری ابتدائی کہانیاں بالعموم حب الوطنی اور ملک کی قربانیوں پر مبنی کہانیاں ہیں،یہ ہماری قومیت کی جنگ کا پہلا دور تھا جسے مورخ ایک خاص طرح کی شہادت،قربانی اور مٹی کی محبت میں مر مٹنے والے لوگوں کی خود فراموشی کی کہانی کا دور کہتے ہیں۔پریم چند کی ابتدائی کہانیوں اور ناولوں میں بھی اس قربانی اور شہادت کی باتیں ہیں۔پریم چند کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے رانی سارندھا اور راجا ہر دول،اور بنڈیل کھنڈ کے راجپوتوں کی بہادری کی کہانیاں لکھی ہیں اور اس بنیاد پر اُنھیں احیا پسند بھی کہا گیا ہے۔ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا ہے کیوں کہ جنگِ آزادی کے اُس دور کو مورخین نے کچھ انقلابی لوگوں سے جوڑ کر Militant Hindu Revivalism یا Militant Nationalism کا نام دیا۔یہ جو انتہا پسند قومیت پسندی تھی،وہ انتہا پسند قومیت پسندی ایک خاص طرح کی حب الوطنی اور دیش بھکتی کے غیض وغضب کو ہمارے سامنے رکھتا ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ جنگِ آزادی کے اولین دور میں دو طرح کے خیالات کا تصادم ہو رہا تھا۔ایک طرف گوکھلے جیسے لوگ تھے اور اُن کے پیچھے دادا بھائی نوروجی کی روایت تھی۔کچھ ایسے مغربی خیالات سے متاثر مفکرین تھے اور جن کی حب الوطنی میں کوئی کمی نہیں تھی لیکن جو مغرب کے جدید علم،فلسفہ اور جدید سیاسی نظریات کی ساری دانشورانہ خوبیوں کو ہمارے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔اِس کے برعکس تلک اور اُنھیں کے جیسے کچھ اور مفکرین تھے جو مغرب کے کٹر نقاد تھے اور مغرب کے بالمقابل اپنے روایتی قومی امتیازات کا احیا چاہتے تھے اور یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہم مغرب سے کسی معاملے میں کم نہیں ہیں۔اِن لوگوں کے خیالات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عام طور پر یہ اتنے جدید نہیں تھے۔اس زمانے کی زبان میں جو Liberalism تھا،اُس سے مختلف یہ لوگ جس طرح کی قومیت پسندی اور حب الوطنی کی حمایت کر رہے تھے،اُس میں کہیں نہ کہیں اندھی قومیت پسندی کی گندگی ملتی تھی۔اِس لئے اِن میں انتہا پسندی تو زیادہ تھی لیکن احیا پسندی بھی تھی۔اگر آپ اپنے ملک کی عزت و افتخار کی خاطر طاقت حاصل کرنے کو جائز تسلیم کرتے ہیں تو اس میں کہیں نہ کہیں یہ خطرہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ کچھ pessimist کہیں حال کی رکاوٹوں اور مسائل سے ہٹ کر ماضی میں نہ چلے جائیں۔یہ بہت بڑا سوال ہے کہ اُس تاریخی دور میں صحیح کون تھا؟ یہ لوگ جو مغرب کی اُتنی مخالفت نہیں کرتے تھے اور مغرب کی خواہشات کو مرکز میں لے آنا چاہتے تھے،وہ صحیح تھے یا وہ صحیح لوگ تھے جو مغرب کے مقابلے سابقہ ہندوستانی روایات کو اچھا مانتے تھے

اور ماضی کو یاد کر کے، یاد دلا کر کے، قربانی اور شہادت کے لئے لوگوں کو تیار کیا کرتے تھے؟ میں نے کہا کہ یہ بہت بڑا سوال ہے۔ ٹھیک ٹھیک اس کا فیصلہ آج بھی نہیں ہو سکا ہے لیکن اور دو پہلو اس کے ہو سکتے ہیں کہ جدیدیت پسند مصلح صحیح تھے یا قومیت پسند صحیح تھے یا احیا پسند صحیح تھے؟ دوسرے لفظوں میں گوکھلے اور رانا ڈے صحیح تھے یا تلک؟ فیصلہ آپ کریں لیکن یہ ایسا سوال ہے جو بہت دنوں تک ہمارے غور وفکر کی بنیاد میں رہا ہے اور آج بھی ہے۔ لیکن اس سوال کا حل آج تک نہیں تلاش کیا جا سکا ہے۔ اور مختلف اور متضاد خیالات کے مابین تصادم آج بھی جاری ہے۔ پریم چند کے ادب میں، گاندھی جی کے خیالات میں، جواہر لعل نہرو کی زندگی اور فکری سطح میں، اِن دونوں کا تصادم مشرق بنام مغرب کی طرح چلتا رہا تھا۔

جو لوگ پرساد کے پیروکار اور چاہنے والے ہیں، وہ عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ پریم چند صرف حال تک اپنے کو محدود رکھتے تھے، مستقبل کی طرف نہیں دیکھتے تھے، ماضی سے اُن کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور یہ کہنے کے لئے وہ 'گئودان' کے کردار مہتا کا وہ مشہور قول پیش کرتے ہیں، جس میں اُس نے کہا ہے کہ میں ماضی اور مستقبل دونوں سے الگ حال میں جینا چاہتا ہوں''۔ پروفیسر مہتا کا ماننا تھا کہ ماضی اور مستقبل دونوں ہمارے لئے نقصان دہ ہیں، دراصل ہمیں حال میں جینا چاہیے، اِسی کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ پریم چند عموماً حال تک خود کو محدود رکھتے تھے اور اِسی کی بنیاد پر پریم چند کو ''تجربیت پسند' اور 'اخلاقیت پسند' بھی کہا جاتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو یاد دلانا چاہوں گا کہ پریم چند اپنے ادب میں 'نشاۃ ثانیہ' کی روایت کی توسیع کرنے والے جنگِ آزادی کے مجاہد تھے۔ اُن کا رشتہ ماضی سے سو فیصد کٹا ہوا بھی انہیں تھا۔ ماضی کی بہادری، شجاعت، قربانی، جفاکشی اور راجپوتوں کی قربانی کی کہانیاں لکھ کر وہ کسی ذات پات کا پرچار نہیں کر رہے تھے اور نہ اُن کی قربانی کی کہانیاں بیان کر کے وہ کسی مخصوص قومیت پسندی، اندھی قومیت پسندی کی حمایت کر رہے تھے بلکہ اُس دور میں عوام کے اندر کے تیاگ اور قربانی کی کہانیاں لکھ رہے تھے، اُن لوگوں کی کہانیاں لکھ رہے تھے جو اپنی گز بھر زمین کے لئے اور اپنی آن، اپنے اصول کے لئے اپنی جان تک دے دیتے تھے، اور یہ ساری کہانیاں صرف راجاؤں کی قربانیوں کی کہانیاں نہیں ہیں۔ بندیل کھنڈ کے جو ہیرو ہوئے ہیں، اُن شہیدوں میں معمولی کسان بھی ہیں۔ اِس لئے اپنے ابتدائی دور کی کہانیوں، حکایتوں کے ذریعہ پریم چند نے یہ دکھایا ہے کہ سیدھے سادے معمولی کسان اپنی زمین، کھیت، گھر اور بہو بیٹیوں کی عزت کے لئے کس طرح جان دے دیتے ہیں۔ دراصل پریم چند نے جذبۂ حب الوطنی سے ہی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔

اِس حب الوطنی کے دور میں رومانیت اور مثالیت پسندی زیادہ تھی۔ اِس کے بعد ہی ایک اہم تبدیلی جو ہماری قومی تحریک میں ہوتی ہے، وہ ہے 1917 میں روس کے عظیم انقلاب کا اثر۔ اس عظیم اکتوبر انقلاب کی دھمک دنیا کے ہر ملک میں سنائی پڑی۔ ہر طبقے کے لوگوں پر اس کا اثر پڑا ۔ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں، مفکروں اور عوام پر بھی اس کا اثر پڑا اِس کے ساتھ میں ہندوستانی سیاست میں واضح طور پر جو بہت ہی قابلِ ذکر تبدیلی آئی وہ یہ ہے کہ ہماری جنگِ آزادی میں بہت بڑے عوامی گروہ کا جسے ہم ہندوستانی کسان کے طور پر جانتے ہیں، اِن کسانوں کا داخلہ ہوا۔ اِن کسانوں کی ہندوستان کی جنگ آزادی میں شمولیت کے محرک گاندھی جی بھی تھے۔ گاندھی جی کی پوری زندگی میں کیا اہم ہے، ہم لوگ اِس سے بخوبی واقف ہیں۔

اِس دوسرے دور کے بارے میں بحث کرتے وقت ایک حقیقت کا ذکر کر دینا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ سماج کے مصلح

پریم چند جب اِس دور میں داخل ہوتے ہیں،تو اِس سے قبل وہ اپنے ناول 'سیوا سدن' (بازارِ حسن) کے ذریعے ہندی دنیا میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ یہ پہلا ناول تھا جس نے پریم چند کو ایک عظیم کہانی کار کے طور پر مشہور کیا تھا۔عموماً اِس ناول کو جنگِ آزادی سے جوڑ کر نہیں دیکھا جاتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ طوائف کی زندگی پر مبنی کہانی ہے۔کبھی کبھی یہ بھی تصور کیا جاتا ہے کہ یہ ناول غالباً شرت چندر کی روایت کا پاسدار ہے۔قابل توجہ بات ہے کہ ہمارے ہاں نشاۃ ثانیہ میں ایک طرف حُب الوطنی تھی تو دوسری طرف سماج میں اصلاح کی باتیں کی جارہی تھیں۔ یہ اصلاح پسندی کا دور تو تھا ہی،جس کے تحت یتیم خانے کھولے جارہے تھے۔ بیوہ کی شادی کی باتیں کی جارہی تھیں لیکن عورتوں اور طوائفوں کے مسائل کو 'سیوا سدن' (بازارِ حسن) ناول میں جگہ دے کر جیسا کہ بعض قابل ناقدوں نے دکھایا ہے، پریم چند نہ بیوہ کی شادی کے مسائل کو حل کرتے ہیں اور نہ ہی پورے ملک کے۔ وہ دراصل ہماری توجہ عموماً بیواؤں،طوائفوں اور یتیموں کی طرف مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ پریم چند نے اس ناول کے ذریعہ صحیح معنوں میں عورتوں کی عزت،وقار اور حقوق کے سوال کو اٹھایا ہے۔عورت کے حق کا سوال نہ اصلاح پسندی ہے اور نہ کسی بورژوا فلسفہ کا خدوخال بلکہ کسی بھی سماج اور نظام میں جہاں مختلف طرح کے استحصالوں کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ اِنسان کے ذریعہ انسان کے استحصالوں کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔اُس میں ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ عورتوں کے استحصال کا خاتمہ کر کے مرد اور عورت کو برابر درجہ دیا جائے۔سمن کا پورا درد،سمن کی جدوجہد اور جن وجوہات سے وہ طوائف بنتی ہے ،اُن وجوہات کو پریم چند دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ایسی عورت جو طوائف ہے،زیادہ عزت پاتی ہے اور ایک وہ عورت ہے جو شادی شدہ ہے،گھر میں رہتی ہے،وہ نہ گھر میں عزت پاتی ہے اور نہ گھر سے باہر عزت پاتی ہے۔ایک عورت جو طوائف ہے،ٹھیک اُس کے سامنے آتی ہے اور تمام بڑے بڑے لوگ،رئیس زادے ،چاہے ہندو ہوں،مسلمان ہوں،مذہب کے ٹھیکے دار ہوں،وہ اُس کے قدموں میں لوٹتے ہیں ،اس کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے جو عورت کو عزت دلاتی ہے؟ دراصل اس کی بنیاد میں صرف یہی بات نہیں کہ صرف عورت کی عزت حاصل کرنے کے لئے سمن طوائف بن جاتی ہے۔ پورے ناول میں تبدیلی اس بات سے نہیں ہوتی ہے بلکہ عورت کس طرح اپنا حق پا سکتی ہے،اِس کا سوال سے ہوتی ہے۔ پریم چند 'سیوا سدن' کے ذریعہ عورت کی آزادی کے پس پشت معاشی نظام کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ممکن ہے کچھ دوستوں کو اِس میں زیادہ تضاد دکھائی دے اور وہ اُسے طوائف پر لکھے گئے ناول کے بطور ہی دیکھنا چاہیں لیکن پریم چند،جینندر اور شرت چندر کو ملا کر عورت کے حوالے سے اُن کے نقطۂ نظر کا تقابلی مطالعہ کر کے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ پریم چند ہر مسئلہ کی تہہ میں اور بنیاد میں جاتے ہیں اور یہ پتہ لگاتے ہیں کہ عورت سے متعلق مسائل کی بنیاد میں کون سا سماجی نظام ہے؟ وہ سماجی نظام جس معاشی آلۂ کار پر ٹکا ہوا ہے، پریم چند وہاں انگلی رکھے بغیر واپس نہیں لوٹتے۔ اِس لئے پریم چند کی حب الوطنی صرف مثالی حب الوطنی ہی نہیں تھی اور نہ سماج کی برائیوں کو دور کرنے تک ہی محدود تھی بلکہ پریم چند نے سماجی نظام کی تہہ میں جانا شروع کر دیا تھا۔ اِسی لئے 1917 کے اکتوبر انقلاب اور گاندھی جی کی قومی تحریک میں کسانوں کے کارناموں کے زیر اثر ہی ساتھ ہی پریم چند نے اہم ناول 'پریم آشرم'' لکھا۔

یہ ''پریم آشرم' اب تک بعض نقادوں کے ذریعہ اِس لئے ٹھکرا دیا جاتا ہے کہ اپنے زمانے کے مطابق پریم چند نے اس ناول کا خاتمہ آشرم میں کیا۔اُس زمانے میں ہر مسئلہ کا حل ایک

آشرم قائم کر کے پیش کیا جاتا تھا لیکن اِس ناول کی ایک دوسری جہت بھی ہے جسے نظر انداز کر کے اکثر اِسے گاندھی وادی ناول کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ اِس میں قلب ماہیت کی کہانی بھی دکھائی جاتی ہے کہ کس طرح زمین داروں میں سے ایک کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور اِس لئے کہیں نہ کہیں اِس میں گاندھی وادی اثر دکھائی دیتا ہے لیکن ایک اہم بات جس پر لوگ دھیان نہیں دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ''پریم آشرم'' میں پریم چند صرف آشرم قائم کرنے کی اپیل نہیں کرتے، وہ صرف یہ دکھانے کی کوشش نہیں کرتے کہ زمین دار کا دل بدل جاتا ہے اور وہ غریبوں اور کسانوں کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے اور خود کو اُن کے برابر محسوس کرنے لگتا ہے بلکہ اس سے قبل پریم چند بڑے پیمانے پر دکھاتے ہیں کہ زمین دار اور کسان کے مابین ایک اندرونی کشمکش ہوتی ہے کیوں کہ دونوں کے مفادات ایک جیسے نہیں ہیں۔ متعدد مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کسان کو لاچار ہو کر زمین دار وں کے ظلم وستم کے خلاف آواز بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ پریم آشرم کے بلراج اور منوہر کارندے غوث خان کا قتل کر دیتے ہیں۔ اور جیل چلے جاتے ہیں۔ اِس معاملے میں صرف زمین دار کا کارندہ ہی نہیں ہے بلکہ پولیس کے افسر بھی شامل ہیں۔ پریم چند پورے لکھن پور گاؤں کی سرگرمی گاؤں کے چوپال سے شروع کرتے ہیں۔ ایک جیتا جاگتا ہوا گاؤں ہمارے سامنے آتا ہے اور رفتہ رفتہ کسان اور زمیندار آپس میں ٹکراتے ہیں۔ پریم چند جب یہ ناول لکھ رہے تھے تو چوراچوری کا واقعہ ان کے سامنے تھا اس واقعہ میں کسان اِس حد تک بیدار ہو گئے تھے کہ اُنھوں نے ہتھیار تک اٹھا لئے تھے اور گاندھی جی کو اپنی تحریک واپس لینی پڑی تھی۔ پریم چند اگر اُس دور کی سیاست کے پیچھے چلتے، تو اِس پورے ناول میں زمینداروں اور کسانوں کی دوستی پر زور دیتے، کسانوں اور زمینداروں کی جدوجہد، اُن کے تصادم پر زور نہیں دیتے۔ پریم چند کے سامنے کوئی رہنما نہیں تھا، مفکر نہیں تھا۔ اُن کے سامنے ہندوستان کے عوام تھے، کسان تھے اور وہ عام زندگی کی سچائیوں کو دکھانے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ ''پریم آشرم'' میں اُنھوں نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سامراجیت یا انگریزی حکومت کے خلاف لڑنے کا سوال جب بھی کھڑا ہوگا، تو اُس کے ساتھ ہی انگریزی حکومت جن دیسی سرمایہ داروں کی حمایت کے زور پر ملک میں قائم ہے، اُس کے سامنتی پہلوؤں کے خلاف لڑنے کا جوش وجذبہ بھی سامنے آئے گا۔ پریم چند کے ذہن میں یہ واضح تھا کہ وہ بڑے زمیندار اور رجواڑے ہیں جن کے زور پر انگریزی حکومت یہاں قائم ہے۔ اِس لئے جب تک ان کے خلاف لڑائی نہیں چھیڑی جاتی، تب تک انگریزی حکومت کو یہاں سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ پریم چند سیاستدانوں کے آگے تھے یا پیچھے تھے؟

1919 اور 1920 کے آس پاس کے ادیب یہ دکھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ سامراجیت کی مخالفت کا مطلب ہے سرمایہ دار کی مخالفت۔ جب تک سرمایہ دار کی مخالفت نہیں کی جائے گی تب تک صحیح معنوں میں پورے طور پر سامراجیت کی مخالفت نہیں ہو سکتی۔ پریم چند کا یہ نظریہ اُنھیں سماجی اصلاحات سے آگے لے جاتا ہے۔ اُن کا یہ نظریہ اس سمت میں ایک نیا قدم ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ اس بات کا فیصلہ بڑی مشکل سے طویل جدوجہد کے بعد 1929 میں ہوا تھا جسے حلفیہ طور پر 26 جنوری 1930 کو پورے ملک نے قبول کیا۔ ''مکمل سوراجیہ'' کا خاکہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے پیش کیا تھا اور یہ اعلان کیا تھا گیا کہ سواراجیہ کی مانگ ہندوستان کی پہلی مانگ ہے لیکن یہ طے کرنے میں دس دن لگ گئے اس کے علاوہ ہمارے سوراجیہ کا خدوخال کیا ہوگا، آزادی کا مطلب کیا ہوگا، انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے کا مطلب کیا ہے۔ کانگریس کو یہ سب طے کرنے

میں دس سال لگ گئے۔ اُس فیصلہ سے قبل پریم چند 'پریم آشرم' کے ذریعے یہ دکھا چکے ہیں کہ اُس سوراجیہ کا خدوخال دراصل یہاں پر تمام سامنتی طاقتوں کے خلاف جدوجہد کر کے ہی طے ہوگا اور اِس معاملے میں پریم چند کو کبھی کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔ جہاں تک حکومت کا سوال ہے تو اِس کے بارے میں اُنھوں نے بہت واضح طور پر اس کا تعارف پیش کیا ہے۔ اپنے ایک ناول میں جو اسی دور میں کچھ آگے لکھا گیا ہے۔ پریم چند نے 'حکومت' کیا ہے؟۔ اس سوال کو بہت راست طور پر پیش کیا ہے۔ سیاست کی کتابوں میں What is Govt.and State کی جیسی تعریف کی جاتی ہے، یہاں ویسا تو کچھ نہیں ہے۔ لیکن پریم چند ایک عام کسان کی زبان میں اس کی تعریف پیش کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمیوں نے غریبوں کو دبائے رکھنے کے لئے ایک تنظیم بنا لی ہے۔ اُسی کا نام 'حکومت' ہے (قہقہہ)

یہ وہ تعریف ہے جسے بہت پے چیدہ زبان میں سیاسیات میں سمجھایا جاتا ہے اور حکومت اور ریاست کی بہت باریک کتائی کی جاتی ہے۔ پریم چند نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ کسان حکومت کو کس طور پر دیکھتا ہے۔ یہ 'سرکار' کی تعریف اپنی سادگی کے باوجود حکومت کی طبقاتی بنیاد کو واضح کرتی ہے۔ آپ پریم چند کہانیوں اور ناولوں میں دیکھیں گے کہ انصاف کی جدوجہد کرنے والے کون لوگ ہیں۔ اُن میں وکیلوں پر اکثر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ طنز بھی کیا گیا ہے، جگہ جگہ طنز کیا گیا ہے کیوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو rationalise کرتے ہیں اس نظام اور اس کے کام کو۔ کچھ ایسے وکیل بھی تھے جو محبِّ وطن تھے، عاشق وطن تھے، اور کورٹ کچہری کے علاوہ عوام کے لئے جدوجہد بھی کرتے تھے لیکن ایک پیشے کی حیثیت سے اُن کا ایک پورا طبقہ تھا جو سرکار کو قائم رکھتا تھا اور وہ اُسی کے لئے قانون اور اصول بناتا تھا انھیں کا تجزیہ کرتا تھا اور انھیں کے لئے لڑائی لڑتا تھا۔ پریم چند نے اس عمومی انداز میں حکومت کے بارے میں یہ تجزیہ کیا ہے۔

متعدد لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جنگِ آزادی صرف ایک سیاسی جدوجہد ہے۔ آگے چل کر کچھ لوگوں نے اس جنگِ آزادی کو اقتصادی جدوجہد میں بدل دینے کی کوشش کی۔ وہ مارکسی لوگ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ سیاسی جنگ نہیں ہے بلکہ اقتصادی جنگ ہے ، لگان کی جنگ ہے۔ پریم چند اس آزادی کو بہت واضح طور پر دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ آزادی ، قومی آزادی تھی ، سیاسی آزادی تھی ، اقتصادی آزادی تھی اور اس سے کہیں زیادہ اُس دور میں ذہنی آزادی اور مکمل نظریاتی آزادی کی ضرورت تھی اس لئے اہمیت اس بات کو دی گئی کہ کسان کو جب تک اُس کے پرانے خیالات سے آزاد نہیں کیا جائے گا، تب تک اقتصادی آزادی دے کر بھی آپ اُسے غلامی سے نہیں نجات نہیں دلا سکتے۔ آپ کی تھوڑی سی مہربانی ہو جائے تو اقتصادی سہولت ملنے کے بعد بھی کسان آزاد نہیں ہوسکتا۔ پریم چند نے بہت پہلے یہ لکھا تھا اور انھوں نے یہ اس وقت لکھا تھا جب کانگریس کی طرف سے کہا گیا تھا کہ اس فاقہ کشی کے زمانے میں کسانوں کے لگان کم کئے جائیں۔ پریم چند نے بار بار زور دے کر لکھا کہ کسانوں کے لگان کا نصف ہو جانا ان کے لئے بڑا تحفہ نہیں ہے جتنا بڑا تحفہ اندھی تقلید ، اسطور ، رسم ورواج سے آزاد ہونا ، نشے سے پرہیز کرنا، آپس میں جو جھگڑا بڑھتا جا رہا ہے اُسے روکنا، اُنھیں کارندوں ، پٹواریوں اور دوسرے عملوں کے ظلم سے بچانا ہے۔ یہ ان کی اس سے بڑھ کر خدمت ہوگی کہ اُن کا لگان کچھ کم کروا دیا جائے۔ سیدھی سادی زبان میں آج اُن کا تجزیہ کیا جائے تو کہیں گے کہ کسانوں کا لگان کم کرنے سے زیادہ بڑا تحفہ ہے۔ اُن کو اندھی تقلید سے یعنی جو متعدد فرسودہ مذہبی روایات ہیں، رسم ورواج ہیں اُن سے آزاد کرنا یعنی اُس کی نظریاتی آزادی۔ یہی

نہیں بلکہ سماج کے نوکر شاہی یا افسر شاہی طبقوں سے کسانوں کو جب تک آزاد نہیں کر وایا جائے گا،اس وقت تک لگان آدھا ہونے کے بعد بھی کسان خوش حال نہیں ہو پائیں گے،آزاد نہیں ہو پائیں گے۔اس لئے پریم چند نے اپنے ناولوں میں ایک واضح پیمانے پر آزادی کی بحث کی۔اُن کے لئے آزادی صرف اقتصادی آزادی نہیں تھی،اُن کے لئے آزادی کا زیادہ تہہ دار مفہوم تھا،گہرے سماجی،سیاسی،معاشی اور ثقافتی معنوں میں آزادی۔پریم چند کے ناولوں میں کسانوں کے جس استحصال کا ذکر کیا گیا ہے،وہ استحصال مذہبی اور سیاسی سطح پر ہوتا ہے،فکری سطح پر بھی ہوتا ہے اور سیاسی سطح پر تو ہوتا ہی ہے۔آزادی کا واضح خاکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں،گاندھی جی کے پاس تھا۔اسی لئے ایک طرف وہ آدمی کی سویا بین کھیتی پر بھی لکھتا تھا اور دوسری طرف انگریزی حکومت کے خلاف Draft بھی تیار کیا کرتا تھا۔وہ واضح مکمل انسان کی مکمل آزادی کا تصور رکھتے تھے لیکن گاندھی جی اور پریم چند میں فرق یہ تھا کہ پریم چند اِس آزادی کی طبقاتی بنیاد کو دیکھتے تھے،اُس کو ہمیشہ ذہن میں رکھتے تھے جبکہ گاندھی جی اِسے طبقاتی بنیاد سے آزاد کر کے دوسری سطح پر ذہنی ،روحانی،سماجی اور معاشی سطحوں پر پیش کرتے رہے۔بڑے ہی واضح طور پر اُس آزادی کا تصور پریم چند ''پریم آشرم'' میں ہمارے سامنے رکھا۔''پریم آشرم' ہندی کا ہی نہیں بلکہ ہندوستانی ادب کا پہلا عظیم فنی ناول تسلیم کیا گیا ہے جس میں بڑے پیمانے پر کسان کی زندگی اور کسانوں کے استحصال کو دکھایا گیا ہے۔

پریم چند نے 'جنگِ آزادی' کے ساتھ ساتھ اُس دور کے نہایت اہم پہلو فرقہ وارانہ فسادات پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی۔''جنگِ آزادی'' میں اس فرقہ وارانہ فسادات نے رکاوٹیں پہنچائی۔سوراجیہ کے راستے میں کون سی رکاوٹیں تھیں،اس سوال پر پریم چند نے مضامین لکھے۔اُنھوں نے ''زمانہ'' میں ایک مضمون لکھا تھا آج کا زمانہ کیسا ہے اس کا خاکہ کھینچتے ہوئے اور آگے زمانہ کیسا ہوگا،اُس کا تجزیہ کرتے ہوئے۔حال اور مستقبل دونوں کی شکل کیسی ہو،پریم چند کے ذہن میں اس کا تصور بالکل صاف تھا۔یہ تصور 19-1918 کے آس پاس کے لکھے گئے مضامین میں نظر آتا ہے۔اُنھوں نے اکتوبر انقلاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ دراصل آگے آنے والا زمانہ کسانوں اور مزدوروں کا زمانہ ہو گا۔اس لئے اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے واضح لفظوں میں اُنھوں نے ایک جملے میں کہا کہ سوراجیہ غریبوں کی تحریک ہے۔آج یہ کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن اُس زمانے میں جب پریم چند ہوا کرتے تھے،سوراجیہ کے حوالے سے بہت متمول لوگ جیل جا رہے تھے اور اچھے خاصے نوکری پیشہ لوگ نوکری چھوڑ کر جیل جا رہے تھے،اُس زمانے میں لگتا نہیں تھا کہ سوراجیہ عام لوگوں کی تحریک ہوگی ۔اُس زمانے میں جبکہ جیل بھیجنے والے اور رہنمائی کرنے والے عموماً بڑے باپ کی اولاد ہوا کرتے تھے،اُس دور میں بھی پریم چند سمجھاتے رہے کہ بنیادی طور پر یہ لڑائی غریبوں کی لڑائی ہے،وہاں پر جو لوگ ہیں جن کے مفادات ہیں،وہ غریب ہیں،وہ غریبوں کے مفادات ہیں۔آج جو آگے دکھائی دیتے ہیں دراصل وہ دکھائی ہی زیادہ دیتے ہیں۔حقیقت میں لڑائی کا فیصلہ کُن رول غریب کسان ادا کریں گے۔اور واقعی یہ کام آگے چل کے کسانوں نے کیا بھی۔وہ زاویے سے پوری تحریک کو،جنگِ آزادی کے طور پر دیکھ رہے تھے،اس میں رکاوٹ کے طور پر اُنھوں نے فرقہ پرستی کو دیکھا۔فرقہ پرستی کے نشے کے شکار اچھے اچھے لوگ تھے۔فسادات میں جب وہ دیکھتے تھے کہ کبھی مسلمانوں کے ہاتھوں ہندو زیادہ مرے ہیں تو اُنھیں ''سچا ہندو پریم'' اور'' ہندوتو'' خطرے میں دکھائی دیتا تھا اور سارے کا سارا الزام دوسروں پر تھوپ دیتے تھے۔دوسری طرف مسلمانوں کی طرف بھی یہ چیز تھی کہ اگر زیادہ

مسلمان مارے گئے تو وہ سمجھتے تھے کہ ''اسلام خطرے میں'' ہے اور سارے کے سارے ہندو مذہب کے ماننے والوں میں ہی یہ برائیاں ہیں کہ وہ جنگجو ہیں اور قتل و غارت گری کرتے ہیں ۔اس پورے منظر نامے میں پریم چند اکیلے فرد ہیں جنھوں نے اپنے پورے ادب میں لگا تار فرقہ پرستی پر سخت چوٹ کی اور ہندو فرقہ پرست، مسلم فرقہ پرست، عیسائی فرقہ پرست کسی کو بھی نہیں چھوڑا۔اس فرقہ پرستی پر چوٹ کرتے وقت اُنھوں نے ہمیشہ اپنے کسانوں کو سامنے رکھا۔اُنھوں نے دکھانے کی کوشش کی کہ کسان ہندو ہو چاہے مسلمان ہو اس کا دل ایک ہے۔اس فرقہ پرستی پر انھوں نے جب بھی چوٹ کی تو یہ بتانے کی کوشش کی کہ فرقہ پرستی کی بنیاد میں، فرقہ وارانہ فسادات پھیلانے والے دراصل امیر لوگ تھے ، زمیندار تھے۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات کرواتے ہیں اور عام کسانوں کو، عام کھیتی مزدوروں کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ جنگِ آزادی کے دوران فرقہ پرستی کے بارے میں اتنی گہری نظر سے کسی اور نے لکھا ہے۔فرقہ وارانہ فسادات کروانے کا سبب مذہب نہیں ، مذہبی رجحان بھی نہیں ہے۔ پریم چند نے اُس وقت سخت لفظوں میں لکھا تھا کہ فرقہ واریت اس وقت ابھرتی ہے جب ہماری تحریک سست ہوتی ہے۔انھوں نے 'زمانہ' میں مضمون لکھ کر بتایا تھا کہ فرقہ واریت کب ابھرتی ہے، فسادات کب ہوتے ہیں۔انھوں نے لکھا کہ جس وقت گاندھی جی سمجھوتہ کرتے ہیں ، کانگریس تحریک واپس لیتی ہے، عوام میں بدحالی آتی ہے ۔ایسے دور میں جو چیز سر اٹھاتی ہے وہ ہے فرقہ واریت۔ سیاسی جدوجہد کی چڑھتی ہوئی ندی میں فرقہ واریت کا کوڑا کرکٹ بہہ جاتا ہے لیکن جب تحریک زوال پر ہوتی ہے، پیچھے ہوتی ہے، ایسے وقت میں اُس پستی اور ناامیدی کے ماحول میں جب کوئی کام نہیں ہوتا تو ان نوابوں اور زمینداروں کے 'جن' آتے ہیں اور فرقہ وارانہ فسادات کا سہارا لے کر عوام کو تقسیم کرتے ہیں، اُن میں تضاد پیدا کرتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ تحریک میں آگے نہ آنے پائیں ۔اس لئے جنگِ آزادی میں جو رکاوٹیں تھیں، مزاحمتیں تھیں ، اُن کے بارے میں اُس وقت کی سیاسی پارٹی کس طرح سوچتی تھی اور پریم چند کس طرح سے سوچتے تھے۔ یہ اُن کی تخلیقات میں بہت صاف طور سے دکھائی دیتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ اگر اُن کی تخلیقات کے عہد عمل کو آپ دھیان میں رکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پستی کے دور میں جب تحریک رُکی ہوئی تھی ، پریم چند نے جدوجہد کی التجا کی تھی، 'رنگ بھومی' کب لکھا گیا؟ اُس وقت ہماری تحریک کی کیا حالت تھی؟ 25-1924 میں گاندھی جی نے کون سی تحریک چھیڑی تھی؟ رنگ بھومی کا سورداس جان سیوک زمین کے لئے کس طرح لڑائی لڑتا ہے، کس طرح عوام کو پیغام دیتا ہے۔وہ اس اندھے بھکاری کی لڑائی تھی جبکہ جان سیوک اکیلا نہیں ہے ۔اس کا ساتھ دینے والے زمیندار ہیں ۔ پریم چند نے یہ دکھایا ہے کہ چاہے وہ ہندو ہو، مسلمان ہو یا عیسائی سب ایک جیسے ہیں۔ پریم چند نے بتایا کہ سرمایہ دار کی مدد کرنے کے لئے سماج کی کتنی اور کون کون سی طاقتیں جمع ہوتی ہیں، ایک ساتھ ہوتی ہیں۔دوسری طرف سورداس اُن کے خلاف گاؤں کے اُن کسانوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کبھی متحد ہی نہیں ہو سکتے ۔اسے منفی احساس یا تاریخ کا المیہ کہہ لیجیے کہ رنگ بھومی جنگِ آزادی کے اس دور کی تاریخ ہے جب جنگِ آزادی راست طور سے نہیں چل رہی تھی، تحریک جس وقت پستی میں تھی۔سورداس پریم چند کا سب سے جری ہیرو کے طور پر سامنے آتا ہے شاید ادب میں اُس کے جوڑ کا کوئی دوسرا 'ہیرو' نہیں ہے۔ یہ 'ہیرو' تب سامنے آیا جب قومی تحریک زوال پر تھی۔کمزور ہو رہی تھی۔ پریم چند نے کہا تھا کہ ادب وہ مشعل ہے جو سیاست

کے آگے چلتا ہے ۔ پریم چند 'رنگ بھومی' کے ذریعہ یہ دکھانے اور ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان ناولوں کے متوازی پریم چند کی اس طرح کی اسی رو میں لکھی گئی کئی اور کہانیاں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں۔اس وقت پریم چند کا آخری دور شروع ہوتا ہے۔1930اور اس کے آس پاس آپ میں سے بہت سے بزرگ ہوں گے جنھوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ہوگا۔اس وقت میں تو بہت چھوٹا تھا تین سال کی عمر تھی میری لیکن 1930 بہت اہم اور فیصلہ کن سال ہے۔اس وقت ایک طرف تو خیال کی سطح پر سوراجیہ کا عزم لیا گیا دوسری طرف یہ وہی سال تھا جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی اور گاندھی جی بھگت سنگھ کی رہائی کی کوشش نہیں کی تھی ۔ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ گاندھی اور اِرون کا معاہدہ تھا اس وقت،ایک طرف انقلابیوں میں سے ایک پھانسی کے دار پر چڑھ گیا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد الفریڈ پارک میں چندر شیکھر آزاد گولی کے شکار ہوئے یعنی انقلابیوں کی شہادت کا وہ سلسلہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی جاتی ہے اور چندر شیکھر آزاد الفریڈ پارک میں لڑتے ہوئے گولی کے شکار ہوتے ہیں۔اسی وقت گاندھی اور اِرون کا معاہدہ ہوتا ہے اور دوسری طرف سوراجیہ کی واضح تعریف پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور قول سے زیادہ عمل پر زور دیتے ہیں لگ بھگ یہیں سے پریم چند کا وہ عہد شروع ہوتا ہے جسے آپ گاندھی وادی قدروں اور اہمیتوں کے تئیں اُن کی محبت کے خاتمے کا عہد کہتے ہیں۔

پریم چند کا ناول 'غبن' اسی دور میں لکھا گیا۔عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ 'غبن' میں زیور کی محبت کی کہانی ہے یعنی رماناتھ کی بیوی جالپا زیورات زیادہ چاہتی ہے۔پورے ناول کو زیور کی محبت کا ناول کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے لیکن اس ناول میں پریم چند نے متوسط طبقہ کے ہیرو رماناتھ کے کمزور اعتماد کو دکھاتے ہوئے متوسط طبقہ کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ شہری متوسط طبقہ کا آدمی کس طرح hypocrisy کا شکار ہو جاتا ہے۔متوسط طبقوں کی حالت تو یہ ہے کہ بدتر حالت کی وجہ سے بیوی کے سامنے اپنے کھانے پینے کی کے معاملے میں خوشحالی دکھانا چاہتا ہے اور اندر سے وہ اتنا کھوکھلا ہے کہ ایک چھوٹی سی چیز بھی بیوی کو نہیں دے سکتا ۔ان دو حالات کے مابین لڑھکتا اور جھولتا ہوا رماناتھ کہاں جاتا ہے؟ وہ اس حد تک جاتا ہے کہ غدّار ہو جاتا ہے۔آپ دیکھیں کہ کیمرہ چاہے جہاں گھومے لیکن جو'زاویۂ' ہے وہ کسان کا 'زاویۂ' ہے اور پریم چند کی نظر ایک لمحہ کے لئے بھی ادھر ادھر نہیں ہوتی۔اسی نظر سے وہ ساری دنیا کو دیکھتے ہیں۔جانے کہاں سے رماناتھ گھومتا ہوا جب شہر میں پہنچتا ہے تو دیوی دین کھاٹک کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور یہ دیوی دین کھاٹک سوراجیوں کے بارے میں جو تنقید کرتا ہے،وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ان سوراجیوں کے بارے میں دیوی دین کھاٹک کہتا ہے کہ ابھی تو ان کا راج نہیں آیا ہے تب یہ حال ہے! جس دن ان کا راج آجائے گا ،اُس دن نہ جانے یہ کیا کریں گے؟1930 میں پریم چند کا دیوی دین کھاٹک یہ کہتا ہے جسے 1947 کے بعد کے دیوی دین کھاٹک آنکھوں کے سامنے دیکھنے والے تھے! یہ قول نامناسب نہیں ہے۔پریم چند نے اسے دکھایا اور تب سے ،1930 کے بعد سے لگاتار اُن کی تخلیقات میں ایک حقیقت اجاگر ہوتی جاتی ہے اور وہ یہ کہ کسانوں کو ساتھ لے کر لڑنے والا یہ جو زمینداروں کا طبقہ ہے وہ نام نہاد دیش بھکت طبقہ عین موقع پر،جب بھی خود غرضیوں سے متصادم ہوگا،کسانوں کے ساتھ بے وفائی کرے گا۔میدان عمل میں یہی ہوتا ہے،کایا کلپ میں بھی یہی ہوتا ہے۔مسلسل پریم چند یہ دکھاتے ہیں کہ یہ بڑے گھروں کے لوگ جو آج جنگِ آزادی میں کسانوں کو مجتمع کر رہے

ہیں اُنھیں ساتھ لے کرلڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب اُن کی مفادات پر چوٹ لگے گی تو وہ بے وفائی کریں گے۔

پریم چند کا ادب صرف گاندھی واد کی تعلیم نہیں دیتا ،صرف جنگِ آزادی کی کہانی نہیں کہتا۔اُن کا ادب کسان اور عام عوام کواوراُن کے لئے کام کرنے والے دانشوروں کو درس دیتا ہے کہ کس طرح اس عوام کوساتھ لے کر چلنے والے رہنما ،قومیت پسند ،محبان وطن اورقومیت کے لئے جدوجہد کرنے والے بنیادی طور پر اورآخر کاراپنے طبقہ کے مفادات کے لئے لڑتے ہیں اور جب اُن کے طبقاتی مفاد پر چوٹ لگتی ہے،تو وہ چولا بدل لیتے ہیں اور اُس کے مخالف ہوجاتے ہیں۔ یہی ُغبن ُمیں ہوتا ہے،کایا کلپ میں ہوتا ہے،میدان عمل میں ہوتا ہے اورآگے چل کر ُ ُگئودان میں بھی ہوتا ہے۔گئودان کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔اس دور کی تخلیقات میں قلب ماہیت،اہنسااور باقی چیزیں ختم ہوجاتی ہیں۔آپ دیکھیں گے کہ پریم چند کے پورے ادب طبقاتی کش مکش میں جدوجہد کی بات بار بارآتی ہے۔اس جدوجہد کی جتنی کہانیاں نظرآتی ہیں،اُن میں ایک طرح کا اعتماد دکھائی دے گا۔پریم چند کہا کرتے تھے کہ طاقت جدوجہد ہےاورادب کا مقصد ہے۔اس جدوجہد کی طاقت کودنیا کے سامنے اجاگر کرنا ممکن ہے۔یہ انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں اپنی تقریر میں کہاپھر ’’کہانی کا عہد‘‘ نامی مضمون میں لکھا کہ طاقت جدوجہد میں ہے اوراسی جدوجہد سے ادب کی ترقی ہوتی ہے۔اس لئے جولوگ سمجھتے ہیں کہ پریم چند مخصوص طبقہ کی مدد کی تشہیر کر رہے تھے،اُنھیں میں کہنا چاہوں گا کہ اُن کے ناولوں کا پورااصل طبقاتی جدوجہد کی حمایت ہے۔جوطبقاتی جدوجہد کی مشعل کوروشن کرتا ہے۔اُن کے ناولوں کا خاتمہ بھلے ہی نصیحت میں ہوتا ہو،کسی طرح کے آشرم میں ہوتا ہو۔ناول کا اندرونی ڈھانچہ کیسا ہے یہ بات زیادہ اہم نہیں۔اہم بات جدوجہد کی حمایت ہے۔اسی لیے آخر میں ان کا پیغام زیادہ اہم ہوجاتا ہے۔

ان کی کہانیوں کی بات کرتے وقت ایک اورقابل ذکر بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ پریم چند ’’سرمایہ دارانہ نظام‘‘ ،’’سامراجیت‘‘ وغیرہ الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے،اگرچہ وہ جانتے ضرور رہے ہوں گے۔آج سامراجیت ،سرمایہ دارانہ نظام جیسے الفاظ پڑھے لکھے نوجوانوں کی زبان پر ہر دوسرے جملے میں بغیر سمجھے بوجھے آیا کرتے ہیں۔پریم چند کسان کے سمجھنے کی زبان میں لکھا کرتے تھے۔وہ سرمایہ دارانہ نظام نہیں کہتے تھے۔اگر کہنا ہوتا تو ’’مہاجنی تہذیب‘‘ کہتے تھے کیوں کہ مہاجن کو کسان سمجھتے ہیں ،اس سرمایہ دارانہ نظام کونہیں سمجھتے ہیں۔وہ سامنت واد لفظ کو استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ اس لئے راجے رجواڑے،اورزمیندار جیسے لفظوں کا استعمال کرتے تھے۔

اس دور میں ایک اور بات نظرآتی تھی۔وہ یہ کہ عام لوگ جب سوراجیہ کی تعریف کر رہے تھے اس وقت ملک میں چل رہی قتل و غارتگری سے متنفر ہوکر،سیاست سے سنیاس لے کر ،گاندھی جی اچھوتوں اور ہریجنوں کی بات کر رہے تھے۔اسی دور میں پریم چند نے اپنے ناول ُمیدان عمل ُمیں ہریجنوں کے مسائل کو ابڑے دلچسپ انداز میں اٹھایا۔اس دور میں گاندھی جی کوشش کر رہے تھے کہ ہریجنوں کومندر میں داخل کرادیا جائے اور پرچار یہ کیا جارہا تھا کہ اگر ہریجنوں کومندروں میں داخل کرادیا جائے تو عظیم نقلاب آجائے گا۔پریم چند نے ہریجنوں کے مندروں میں داخلہ کو بڑی خوبصورتی سے میدان عمل میں پیش کیا ہے۔پوری تیاری ہورہی ہے،کانگریسی رہنما لگے ہوئے ہیں کہ مندروں مین ہریجنوں کوداخلہ دیا جائے ،لاٹھی چلتی ہے،پولیس آتی ہے،اُس پورے منظر کا خلاصہ کرتے ہوئے پریم چند کہتے ہیں کہ اُس دن ہریجن مندر

میں گھُس گئے، پجاری اُس دن بہت خوش تھا کہ چڑھاوا سب دن سے بہت زیادہ ملا!(ہنسی) یہ ایک جملہ پریم چند کا پورے ہریجنوں کے مندر میں داخل ہونے پر مبنی تھا! اور آپ کہتے ہیں کہ پریم چند گاندھی وادی تھے، گاندھی کے بھکت تھے! کیا پریم چند ہریجنوں اور اچھوتوں کے مسائل کو صرف مندر میں داخلے تک محدود رکھتے ہیں؟ 'میدانِ عمل' کا وہ منظر پڑھ لیجیے، واضح ہو جائے گا کہ وہ یہ مانتے تھے کہ ہریجنوں کو مندر میں داخل کرنے سے اُن کی اصلاح نہیں ہوگی۔ آپ لوگوں میں بیشتر نے ''ٹھاکر کا کنواں'' نامی کہانی پڑھی ہوگی۔ یہ بہت چھوٹی سی کہانی ہے جوکھوں کسان اور اس کی بیوی گنگی کی کہانی ہے۔ جب جوکھوں پانی مانگتا ہے تو گنگی دیکھتی ہے کہ پانی گندہ اور بدبو دار ہے اور وہ اسے پینے سے منع کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اندھیرا ہو جانے کے بعد میں ٹھاکر کے کنواں سے پانی لے آؤں گی۔ وہ پانی لینے گئی اور آگے کا منظر جانتے ہیں؟ ۔وہ دھیرے دھیرے وہاں گئی اور پانی کھینچ لیا لیکن وہ کنواں کے کنارے تک آ گئی تھی کہ اسی وقت اچانک زمیندار کا دروازہ کھلا ۔اس کے ہاتھ میں ڈور تھی، لوٹا تھا، وہ چھوٹ گیا۔ بھاگتے ہوئے گھر آ کے گنگی نے دیکھا کہ جوکھوں وہی بدبودار پانی پی رہا ہے ۔''ٹھاکر کا کنواں'' کہانی میں کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ ہریجنوں کی کیا حالت ہے اس کو وہ صاف صاف دکھاتے ہیں، اس دور میں وہ اچھوتوں کی اصلاح کے لئے گاندھی واد کا راستہ نہیں اپناتے ہیں ۔ایک یہی نہیں، متعدد کہانیاں پریم چند نے اُن کے بارے میں لکھی ہیں اور آپ یہ دھیان میں رکھیں کہ وہ ہریجنوں کی حالت میں اصلاح کے لئے ہمیشہ اُن کی معاشی بنیاد کو بدلنے پر زور دیتے ہیں۔ جس 'کفن' پر ڈراما کھیلا گیا جس کو آپ تمام لوگ دیکھتے ہیں اور نہ جانے کتنی طرح کی باتیں کہتے ہیں، اُس 'کفن' کے گھیسو اور مادھو چمار ہیں۔ گاؤں میں کام ہے لیکن وہ کام چور ہیں، کام کرتے ہی نہیں ہیں اور اتنی دور تک جاتے ہیں کہ بہویا کہنا چاہیے کہ عورت کا کفن بیچ کر شراب پی جاتے ہیں اور پی کے دھت ہو جاتے ہیں ، ناچتے گاتے ہیں اور مدہوش ہو کر گر پڑتے ہیں ۔اس کہانی میں پریم چند نے صاف صاف لفظوں میں ان کے نکمے پن کی وجہ اُس سماجی نظام کو بتایا ہے جہاں محنت کا مناسب معاوضہ نہیں ملتا۔

پریم چند کی 1930 سے 1936 تک کی کہانیوں میں دو چیزیں آپ پائیں گے۔ ایک تو اس دور کی نوّے فیصدی کہانیاں صرف عام لوگوں اور چھوٹی ذات پر مبنی ہیں یعنی پچھڑی جاتی کو لے کر لکھی گئی ہیں۔ 1930 سے 1936 تک ہماری جنگِ آزادی یا تحریکِ آزادی کی سیاسی تاریخ کو اپنے دھیان میں رکھیں گے تو پائیں گے کہ یہ سیاسی تحریک کس طرح کانگریس کی رہنمائی میں بھٹک رہی تھی کہ پتہ نہیں سوراجیہ کب ملے گا، اس لئے جیسے بھی ہو سمجھوتہ جلد کر لیا جائے۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس اضمحلال کے دور میں پریم چند کسانوں کی زندگی پر کہانیاں لکھتے رہے۔ کسانوں میں بھی وہ جس کو سب سے زیادہ ستایا گیا تھا، جو سب سے زیادہ دلت تھا، استحصال زدہ تھا، مجبور تھا جو سب سے چھوٹی ذات کا تھا اس کو آگے کر کے، اس کے مسائل کو اجاگر کر کے پریم چند چل رہے تھے۔ جب اس ملک میں بایاں محاذ پارٹیاں مزدوروں کو مجتمع کرنے میں لگی تھیں، وہ ہندوستانی کسانوں میں سب سے نچلے طبقے کی معاشی اور ثقافتی بدحالی کو سامنے رکھتے ہوئے ادب لکھ رہے تھے۔

اسی دور میں پریم چند کا آخری ناول 'گئو دان' لکھا گیا گئو دان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہوتی ہیں ۔لوگوں نے گئو دان کے حوالے سے لکھا کہ پریم چند گاؤں کے بارے میں لکھتے تھے، ٹھیک کرتے تھے، شہر کے بارے میں کیا لکھتے؟ شہر کی انھیں کوئی جانکاری تھی۔ پریم چند کی تصویر دیکھ کر، گاؤں میں رہنے

والے کسان سے بالکل ملتے جلتے چہرے کو دھیان میں رکھ کر وہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ پریم چند نے ان سے زیادہ انگریزی پڑھی تھی اور اُن سے اچھی انگریزی جانتے تھے۔ وہ شہر میں بھی رہے تھے۔ بھلے ہی وہ شہر بنارس رہا ہو۔ وہ لکھنو میں بھی رہے تھے، کانپور میں رہے تھے، اسی کانپور میں جہاں گنیش شنکر ودیارتھی رہتے تھے۔ اسی کانپور میں جہاں کمیونسٹ پارٹی کے لوگ گرفتار ہوئے تھے، جہاں مزدوروں کی پہلی انجمن قائم ہوئی تھی۔ ٹھیک سے پتہ لگایا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ گنیش شنکر ودیارتھی ایک فرد نہیں، ایک مرکز تھے، جہاں اس زمانے کے سارے انقلابی جمع ہوتے تھے۔ کمیونسٹ بھی جمع ہوا کرتے تھے، کانگریسی سیاستداں بھی جمع ہوا کرتے تھے۔ ہر طرح کے سیاسی نظریہ کے لوگ وہاں آتے ہیں۔ اُن کے مرکز ومحور تھے۔ گنیش شنکر ودیارتھی۔ اس جگہ پریم چند بھی تھے۔ اس لئے اُن کی اپنی تہذیب، اپنے نظریۂ حیات کی تشکیل میں کانپور کا، کانپور کے ماحول کی فضا کا کیا ہاتھ ہے۔ یہ ایک الگ باب ہے جو تحقیق کا موضوع ہے۔ ہوسکتا ہے، تحقیق کا کام کرنے والے فرد کو ابھی ابھی ایک موضوع ہاتھ لگ گیا ہو (ہنسی) لیکن ان پہلوؤں سے پتہ چلے گا کہ 'گئودان' یوں ہی نہیں لکھا گیا۔ 'گئودان' میں گاؤں اور شہر دونوں کو ساتھ رکھنے کا مقصد بھی ایک ہے۔ سامراجیت کا ایک ستون سرمایہ دارانہ نظام ہے، زمینداروں کا ستون ہے، دوسرے ستون یعنی سرمایہ دارانہ نظام کا ابھی فروغ ہو رہا تھا جس کے بارے میں 'مہاجنی تہذیب' نامی مضمون میں پریم چند نے لکھا تھا۔ ایک نئی صورت حال وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ جنگِ آزادی کے دوران اور وہ یہ تھی کہ اس ملک کے صنعت کار اور زمیندار دونوں اکٹھے ہو رہے تھے، ان کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم ہو رہا تھا، ایک نیا محاذ قائم ہو رہا تھا، آگے چل کے اچانک آزادی کی یہ جدوجہد سامنتواد کے خلاف ہی نہیں، سرمایہ داریت میں تبدیل ہونے والی تھی۔ پریم چند اس ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کو دیکھ رہے تھے اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس سرمایہ دارانہ نظام کا اثر گاؤں پر پڑ رہا تھا، گاؤں اسے اچھوتا نہیں رہ گیا تھا۔ کسان دھیرے دھیرے کھیت مزدور میں بدل رہے تھے اور یہ کھیت مزدور گاؤں چھوڑ کے شہر میں جا کے صنعتی مزدور بن رہے تھے۔ ماہرین معاشیات ترقی کے اس پہلو کو Urbanisation کہتے ہیں اور بڑی تفصیل سے یہ بتاتے ہیں کہ اس کا کیا عمل ہے۔

1932ء میں پریم چند نے 'گئودان' لکھنا شروع کیا تھا۔ اِس دور میں سرمایہ داری کے فروغ کے ساتھ کھیتی میں اور ہمارے پورے سماجی نظام میں ایک نیا پہلو شامل ہو رہا تھا، سماج کا ایک نیا پہلو سامنے آ رہا تھا۔ پریم چند اُسے اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس لئے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ناول میں کھنّا جیسا کردار سامنے آتا ہے۔ کھنّا قومیت پسند ہیں۔ کانگریس میں چندہ دیتے ہیں، جیل بھی جا چکے ہیں۔ اُنھیں مزدوروں سے بڑی محبت ہے۔ یہاں تک ٹھیک ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ مزدوروں کو سرکار بنانے کا حق نہیں ہے اور انھوں نے جو پوری تقریر کی ہے، اُسے دیکھئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں مزدوروں سے بہت محبت ہے لیکن ہمارے مل میں ہڑتال کر کے یہ اپنے مفادات کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ یہ اُس دور کا سرمایہ دار تھا جو ایک طرف تو مزدوروں سے محبت جتاتا تھا اور جب اپنی تنخواہ بڑھوانے کے لئے مزدور ہڑتال کرتے تھے تو سستے مزدور پانے کے لئے کئی طرح کی چال بھی چلتا تھا۔ کھنّا صاحب کے ساجھے دار مرزا صاحب ہیں جو چھٹے حال لوگوں سے کبڈی کھیل کے پیسہ لٹایا کرتے ہیں۔ پریم چند کے پورے ناول میں ایک غریب کسان ہے جو اور کچھ نہیں چاہتا، صرف ایک گائے چاہتا ہے اور وہ گائے اس کا خواب ہو جاتا ہے۔ بچا کھچا

کھیت ایک ایک کر کے نکل جاتا ہے۔اور اپنے ہی کھیت پر مزدوری کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے اُس کا بیٹا گوبر گھر چھوڑ کر شہر جاتا ہے ۔کسان اسی طرح مزدور بنتا ہے۔

کسان سے محبت کرنے والے، آزادی کی لڑائی لڑنے والوں میں پروفیسر مہتا ہیں، مس مالتی ہیں ،رائے صاحب ہیں، تنکھا ہیں ،کھنا ہیں یہ تمام لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں ہوری اُنھیں اپنا بہی خواہ سمجھتا ہے۔رائے صاحب ،کارندے، سود خور مہاجن ، جو کسان سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔اصلاً سب ہوری کے دشمن ہیں۔ ماتا دین ،داتا دین ، پٹواری بھی۔ پریم چند دکھاتے ہیں کہ کسان کا استحصال کتنے نامحسوس طور سے ہوتا ہے۔جن کو ہوری بہی خواہ سمجھتا ہے جس کے پاؤں پکڑتا ہے۔وہ ہی اُس کے استحصال کے اور استحصالی رویہ کے بنیادی کردار ہیں۔اِس استحصال کی کہانی پریم چند نے بطور حقیقت دکھایا ہے۔وہ بتاتے ہیں کہ جنگِ آزادی کسان کے نام پر چل تو رہی ہے لیکن اِس جنگ میں جن لوگوں کے مفادات شامل رہے ہیں۔وہ دراصل کسان کے دشمن ہیں۔

1935-36 کے اُس دور میں ہماری جنگِ آزادی اسمبلی میں کچھ سیٹوں کی چھینا جھپٹی میں، آپس کی دشمنی اور حد درجہ فکری زوال کے بھنور میں پھنس گئی تھی اس سے متفق بہت اچھے دستاویز پنڈت جواہر لعل نہرو کی خود نوشت کے آخری باب میں ہے۔آپ دھیان سے اُسے پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ 1935-36 میں کانگریس کی کیا حالت تھی اور جنگِ آزادی کا کیا حال تھا، غور کرنے پر اُس المناک اور دردناک باب کی اہمیت کو آپ جان سکیں گے۔دوسری طرف گئودان کو اور پریم چند کے بعد کی کہانیوں کو پڑھیں ،تو دیکھیں گے کہ اُن میں اُس زمانے کی تلخی اور کڑواہٹ بھری ہوئی ہے۔رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے اور روشنی کا دور دور تک پتہ نہیں ہے لیکن یہ ناول ادیب کی پکار کے طور پر سامنے آتا ہے تاکہ تاریکی دور ہو۔'کفن' کو ہی لیجیے۔اِسے ناامیدی اور پستی کی کہانی کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ یہ کہانی 'احتجاج اور بغاوت' کی کہانی ہے جس میں گاؤں کے زمین دارانہ نظام کے خلاف کسانوں کی مجبوری اور ناکامی کا اظہار کیا گیا ہے۔

دوستو! پریم چند کی داستان اتنی طویل اور وسیع ہے کہ اُس کے خدوخال کو پیش کرنے میں ہی اتنا زیادہ وقت لگ گیا۔1907 سے 1936 تک اِس جنگِ آزادی میں کتنے رنگ اور کتنے دور آئے اور ہر ایک موقع پر پریم چند سیاست کے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہی تھے۔پریم چند نے قومیت کا درس اسی طرح اپنے ادب میں دیا تھا۔

شرح
دیوانِ غالب
شارح
سید محمد ضامن کنتوری
مرتبہ
اشرف رفیع
قیمت: -/1200 روپے
-/800 طلباء ایڈیشن
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
www.ephbooks.com

انٹرویو

سہیل وحید

عجز وانکسار کا پیکر۔مجتبیٰ حسین

پندرہ اگست کو صبح 5 بجے حیدرآباد کے راجیو گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ سے باہر نکلے تو خوشگوار ہواؤں نے ہمارا خیرمقدم کیا۔آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ ہماری اولا نے چلنا شروع کیا اور چند منٹوں میں ہی اس نے اس سڑک پر رفتار پکڑ لی جو شمس آباد سے ہمیں مہدی پٹنم تک لے جاتی ہے۔اولا ہمیں ہندوستان کے سب سے طویل 12 کیلومیٹر والے فلائی اوور کی سمت لے جارہی تھی جس پر سے اترنے کے کچھ ہی دور پر ماں صاحب ٹینک علاقہ میں ہمارا ہوٹل واقع تھا۔

ایرپورٹ سے فلائی اوور تک کا راستہ بیحد خوبصورت تھا ۔دونوں جانب ہریالی اور ڈوئڈر پر سلیقے سے لگے گول چوڑے ہرے تنے والے بڑے بڑے چار پانچ پتوں والے پام کے درخت۔ان پیڑوں کو جب بھی ہم دیکھتے ہیں تو آر کے اسٹوڈیو کے لوگو کی یاد آجاتی ہے جس میں ہیرو کا ہاتھ ہیروئین کی کمر پر ہے اور ہیروئین نے اس ہاتھ پر ہی اپنی کمر کے اوپری حصے کو پیٹھ کے بل دوہرا کر لٹکا سا دیا ہے۔ پام کے پتوں کی اس ادا میں راج کپور نے عشق کو پنہاں کردیا ہے۔

ہندوستان کے سب سے طویل فلائی اوور کو عبور کرنے میں بہت کم وقت لگا کیونکہ ڈرائیور نے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔اتنی تیز کہ کئی بار مجھے اسے ٹوکنا پڑا تھا۔لیکن اس نے نہیں سنا ۔بہرکیف ہوٹل گولکنڈہ آ گیا۔شاندار اسٹار ہوٹل۔کچھ ہی وقفہ میں ہم لوگ اپنے کمرے میں تھے جس کی سڑکوں کی طرف والی دیوار شیشے کی تھی۔عمدہ نظارہ فلائی اوور پر رواں دواں ٹریفک اور بادلوں سے ڈھکا آسمان۔آرام دہ بستر پاتے ہی جسم کی تھکان سے سیدھے نیند کی آغوش میں پہونچ گیا جہاں سولہویں صدی کی قطب شاہی ریاست،قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریوں اور گولکنڈہ قلعہ کے بنتے بگڑتے نقوش خواب میں میرا انتظار کررہے تھے۔

دوتین گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی،شیشہ کی دیوار سے پردہ ہٹالیا۔سامنے ٹریفک اور آسمان میں بادل دونوں موجود تھے۔موسم اس قدر خوشگوار کہ اس کے خنکی بھرے احساس کو شیشے کے اس طرف بھی محسوس کیا جاسکتا تھا۔کچھ وقفہ سے بونداباندی بھی ہورہی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہوٹل سے باہر نکلا اور چار مینار کا رخ کیا کہ روایتی طور پر حیدرآباد کی پہلی زیارت چار مینار ہی کی ہوتی آئی ہے۔باہر نکلا تو یکسر خیال آیا کہ پہلے ہمیں مجتبی صاحب سے ملنا چاہئے کیونکہ حیدرآباد میں آمد کا اصل مقصد تو مجتبیٰ صاحب سے ملاقات ہی ہے۔

اولا کینسل کی،مجتبیٰ حسین صاحب کو فون کیا۔امنگوں بھری ان کی توانا آواز نے ہمیں چونکا دیا۔لکھنو سے فون پر بات کرتے ہوئے ان کی آواز میں جو ہمہمہ اور تمتما محسوس ہوتا تھا وہ کافی تھا لیکن حیدرآباد میں ہونے پر ان کی آواز کی جولانی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ میں نے بلا تاخیر ان کے رہائشی اپارٹمنٹ کی جانب رخ کیا جو ہوٹل سے تھوڑی سی مسافت پر واقع تھا۔ان کے اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں پہونچے تو دیکھا کہ مجتبیٰ صاحب اپنی ماروتی 800 کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ رہے ہیں۔انہوں نے مجھے دیکھ کر اترنا چاہا لیکن میں نے انہیں بصد احترام روکا اور پھر سلام دعا کے بعد ان کا دست شفقت میرے سر پر تھا۔

مجتبیٰ صاحب سے ملاقات کے سلسلہ میں انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ فون پر بھی انٹرویو ہوسکتا ہے۔لیکن فیصلہ میرا خود کا تھا کہ ہندوستان کے اس عظیم شہنشاہ طنز و مزاح سے طویل ملاقات کے بنا ان پر کچھ بھی لکھنا یا کچھ کام کرنا فن طنز و مزاح کے ساتھ ناانصافی

ہوگی۔

ایک ساعت بھی نہیں گذری تھی کہ باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔انہوں نے بتایا کہ شام کو آدھے گھنٹے کیلئے ٹہلنے ضرور نکلتے ہیں۔اس کار سے بھی ادھرادھر آتے جاتے ہیں۔اسی بہانے ذرا سیر بھی ہوجاتی ہے اور یہی علاج بھی ہے اس بڑھاپے کی بیماری کا۔اور آج سے ٹھیک ایک مہینہ قبل 15 جولائی کو 86 ویں سال میں داخل ہوگیا ہوں۔اب اس عمر میں اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔پھر بولے کہ ہمارے بڑھاپا شباب کو پہنچ چکا ہے۔آدمی کو اتنا بوڑھا کبھی نہیں ہونا چاہئے۔طئے ہوا کہ چارمینار گھوم آنا چاہئے۔آج تعطیل ہے۔بھیڑ کم ہوگی۔مجتبیٰ صاحب نے اپنے ایک شاگرد محسن خان کو میرے ساتھ کردیا اور ہم پہنچ گئے چارمینار۔

سترہ برس قبل جب راموجی راؤ نے اردو ای ٹی وی لانچ کیا تھا تب راقم السطور کا حیدرآباد میں کئی دن قیام رہا تھا۔چارمینار کا علاقہ اس وقت اتنا گنجلک نہیں تھا جتنا اس مرتبہ۔ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ اور خوبچے والوں کو اپنا سب کچھ فروخت کردینے کی عجلت۔اس قدر کنجیشن پیدا کردیا گیا ہے یا ہوگیا ہے کہ سرتاپا چارمینار کا فوٹو بھی لینا محال ہو چکا ہے۔

مکہ مسجد کی تعمیر نو ہورہی ہے۔پہلے کہیں سیکوریٹی نہیں تھی لیکن اب مسجد میں داخلہ کیلئے میٹل ڈٹکٹر سے گزرنا پڑتا ہے۔سخت چوکسی ہے۔ابھی ابھی تھوڑی سی بارش ہوئی ہے اور ہر طرف پانی کیچڑ لئے بہہ رہا ہے۔سترہ سال پہلے چارمینار کو رنگین لائیٹس سے جگمگ کرنے کا انتظام نہیں تھا۔اس بار یہ اضافہ تھا۔برابر والے لاڈ بازار کی دکانوں نے بھی خاصی ترقی کرلی تھی۔اس بازار کی انفرادیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

جدیدیت نے اس کی روایتی وراثت کو ختم جیسا کردیا تھا۔لیکن حیدرآباد میں جو چیز باقی تھی وہ تھا یہاں کا لب ولہجہ ہر طرف وہی جملے اور وہی زبان آج بھی قائم تھی۔جسے دکن کا امتیاز کہا جاتا ہے۔حالانکہ یہ وہی لہجہ تھا جس کا ہزلیہ بالی ووڈ کی فلموں میں معروف اداکار محمود نے بخوبی پیش کیا ہے۔

چارمینار سے واپسی کے وقت محسن خان نے مدینہ مارکٹ کے بارے میں بتایا کہ جب عرب میں تیل نہیں نکلا تھا اور وہاں غریبی تھی تو نظام نے مدینہ مارکیٹ بنوایا جس میں سیکڑوں ملگیاں (دکانیں) ہیں جن کا کرایہ عرب کو بھیجتے تھے نظام ان لوگوں کی مالی مدد کیلئے۔اور یہ ہے اردو مسکن تلنگانہ اردو اکادمی کا آڈیٹوریم جس میں جلسے وغیرہ منعقد ہوتے ہیں اور لائبریری بھی موجود ہے اور یہ رہا نظام کا چومحلّہ پیالیس۔یہ نظام کا حرم تھا کیا؟ میں نے برجستہ پوچھا۔

ہمارے اس سوال کے جواب میں محسن کے چہرے پر محمود اسٹائل کی خجالت تیرگئی اور انہوں نے اس بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔بھیڑ بھرے راستے سے گذرتے وقت اچھا خاصا وقت لگ گیا۔بالاخر ہم لوگ آٹھ بجے کے قریب حسین ساگر جھیل کے پاس تھے۔جھیل کے ایک کنارے پر ایک طویل قطار میں تلگو وغیرہ کے ادیبوں اور شاعروں کے قدآور مجسمے موجود ہیں۔اردو میں صرف اپنے مخدوم محی الدین کا مجسمہ ہی نصب ہے۔ان کے مجسمے کے پیڈسٹل پر تلگو زبان میں نہیں معلوم کیا درج ہے۔ہم نے اس پیڈسٹل کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھا۔اردو کے اس عظیم انقلابی شاعر کے بارے میں اردو میں ایک لفظ بھی کندہ نہیں تھا۔

جھیل کے ساحل پر بنی سیاحی روڈ پر سیلانیوں کی بھیڑ،خوبچوں سے نکل رہی طرح طرح کے لوازمات کی خوشبو اور قریب میں ہی بُھٹے سکنے کی سوندھی مہک بھی مخدوم کے مجسمہ پر اردو کی عدم موجودگی کے ملال کو کم نہ کرسکی۔

اب کسے ہے دماغِ تہمتِ عشق
کون سنتا ہے بات پھولوں کی

چارمینار سے یہاں تک بازاروں میں لگے سائن بورڈوں وغیرہ پر اردو تحریر دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوچکی تھیں۔حیدرآباد میں چاروں طرف اس قدر اردو دکھے گی بھی ہمیں ایسی امید نہیں تھی

لیکن مخدوم کے مجسمے کو اردو سے محروم رکھا جائے گا اس بات کا ذرا بھی اندیشہ نہیں تھا۔

حیدرآباد پہنچنے سے قبل ہی معروف افسانہ نگار شموئیل احمد نے بتایا تھا کہ پتھر کا گوشت ضرورت کھانا، بہترین ہوتا ہے یہاں کا۔ آج کل شموئیل صاحب حیدرآباد میں اسی بارہ کیلومیٹر والے فلائی اوور کے پلر نمبر 177 کے قریب ہی ایک اپارٹمنٹ میں مقیم ہیں۔انہیں اس دسترخوان ہوٹل میں پروفیسر بیگ احساس نے پتھر گوشت کھلایا تھا۔ ہم بھی رات میں اسی ہوٹل میں پہونچ گئے جہاں ہوٹل کے باہر ہی سل جیسے بڑے پتھر کے نیچے گیس جل رہی تھی اور پتھر پر گوشت کی بوٹیاں سینکی جارہی تھیں۔ ساتھ میں بریانی بھی کھائی لیکن اس حیدرآبادی بریانی کے ذائقہ پر ہم کوئی رائے قائم نہ کرسکے۔

اگلے دن صبح ناشتے کے بعد مجتبیٰ حسین صاحب کے گھر پہونچنا تھا۔ طئے شدہ پروگرام کے مطابق وہیں پر تفصیل سے بات ہوئی تھی۔ اسی اپارٹمنٹ میں پہلے فلور پر ان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں مجتبیٰ صاحب سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔

O اس عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ کو جو شہرت، عزت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔اس پر کیسا محسوس کرتے ہیں؟

☆ دیکھئے صاحب! ابھی پچھلے ماہ ہی 15 جولائی کو 86 ویں سال میں داخل ہوا ہوں۔ بہت لمبا عرصہ گذار چکا ہوں۔ بھرپور زندگی جی چکا ہوں بس اب تو وہی شعر:

اب عناصر میں اعتدال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ

پچھلی زندگی کو دیکھتا ہوں، احاطہ کرتا ہوں تو پاتا ہوں کہ سب کچھ ملا، موقع ملا لکھنے کا اور 1973 میں دلی چلے جانے کے بعد تو زندگی کی حسرتوں کے پورا ہونے کا دور شروع ہوگیا تھا۔ اللہ نے موقع فراہم کیا تھا۔

O مجتبیٰ صاحب! بڑا گھسا پٹا سوال ہے لیکن ضروری حصہ ہوتا ہے ہر انٹرویو کا کہ کیسے لکھنا شروع کیا، تو آپ سے بھی یہ سوال حاضر ہے؟

☆ میرے تو خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ میں ایک دن لکھوں گا لیکن لکھنے لگا اور یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ طنز ومزاح لکھوں گا۔ بچپن میں تو ہمیں ایکٹر بننے کا بھوت سوار تھا۔ ایکٹر کے طور پر اپنے آپ کو پہونچوانا چاہتا تھا۔ کالج کے ثقافتی پروگراموں میں حصہ لیتا، ہاسٹل میں پروگرام ہوتا تھا وہاں بھی شامل ہوتا اور نکڑ ناٹکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تا کہ اپنے اندر کی اداکاری میں نکھار پیدا ہو سکے لیکن قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ تحریک آزادی کا دور دورہ تھا۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کی جماعتیں بھی تحریک میں شامل تھیں۔ تقریباً پورے تلنگانہ میں لفٹ تحریک بھی چھا گئی تھی۔ مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور روی نارائن ریڈی کے زیر اثر ایک عام سنگھرش پہلے ہی سے چل رہا تھا۔ ہم سبھی لوگ اپنے آپ کو فطری طور پر بائیں بازو سے قریب تر پاتے تھے۔ 1952 تک گلبرگہ میں رہا۔ وہ بڑا پر آشوب دور تھا۔ بڑی اتھل پتھل تھی۔ فسادات بھی ہورہے تھے۔ میں اپنے ماموں کے پاس پنچولی گیا ہوا تھا۔ وہاں فساد پھوٹ پڑے اور میں نے اپنے حقیقی ماموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس ہولناک منظر کا ڈر میرے اندر تک سا گیا تھا۔ ریشہ ریشہ خوف سے کانپتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے پڑھنا لکھنا جاری رکھا۔ اپنے غم کو اپنے اندر ہی جگہ دی اور اس غم کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا۔ غالباً اسی لئے فطرتاً میں بہت غمگین آدمی ہوں۔ شاید اسی وجہ نے نادانستہ طور پر مجھے لاعلمی میں ہی مزاح نگار بنادیا جب کہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ زمانہ طالب علمی میں ماضی کے انہیں حالات کو بُھلانے کیلئے میں نے ثقافتی پروگراموں میں شرکت کرنا شروع کیا تھا۔

O غم یا دکھ کیا مزاح نگاری کیلئے لازمی جز کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ ابھی آپ نے اشاروں میں بیان کیا؟

☆ اکثر مزاح نگاروں کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے اور میں اپنے بارے میں تو جانتا ہی ہوں، دنیا کے اور بھی کئی مزاح نگاروں کیلئے

بھی ایسا ہی کہا جاتا ہے۔

O تو مزاح نگاری کی ابتداء کیسے ہوئی؟

☆ 1953ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد آئے تو زندگی ہی بدل گئی۔ میں اپنے بھائیوں میں ساتویں نمبر پر تھا۔ یہاں ہمارے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس پہلے ہی سے مقیم تھے اور گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا ہی۔ حالانکہ ہوش سنبھالتے ہی ادب سے وابستگی ہوگئی تھی۔ جب آنکھ کھلی تھی تو جاگیردارانہ نظام کے تحت عثمان آباد میں بھی اتنی ہی آسائشیں موجود تھیں جتنی تصور کی جاتی تھیں۔ ہمارے گھر میں میر وغالب سے لے کر کنہیالال کپور تک کی کتابیں موجود رہتی تھیں۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے میر وغالب سے لے کر نہ جانے کس کس کو پڑھ ڈالا تھا۔ حیدرآباد آئے تو ادب سے دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ اسی دوران میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور ان کے دوست عابد علی خان نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر ایک اردو اخبار نکالنے کا پلان بنایا اور ''سیاست'' نے جنم لیا۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں بڑی غربت تھی۔ فرقہ پرستی اور شدت پسندی بھی بڑھ گئی تھی۔ حالات ابتر تھے۔ ان حالات سے مقابلہ کرنے کے مقصد کے تحت ان لوگوں نے اخبار نکالا تھا۔ میں بھی اس اخبار سے جڑ گیا تھا اور روز شام کو جا کر وہیں کام کرتا تھا۔ اس میں شاہد صدیقی ایک مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کا انتقال ہوگیا تو اچانک مجھے یہ کالم لکھنے کیلئے دے دیا گیا اور اس طرح ایک مزاح نگار نے جنم لیا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ 12 اگست 1962ء کو جیسے ہی میں سیاست کے دفتر میں داخل ہوا، جگر صاحب نے شاہد صدیقی صاحب کا مزاحیہ کالم لکھنے کی ہدایت دی۔ مجھ میں چوں چرا کرنے کی ہمت نہیں تھی کیونکہ میں اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کی بہت عزت کرتا تھا اور ان کی ہر بات میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

O اچانک کوئی مزاح نگار یوں تو نہیں بن جاتا جیسا کہ آپ نے بتایا، کہیں نہ کہیں مزاح نگاری کے عنصر آپ کے اندر ضرور موجود رہے ہوں گے۔ کیا وہ کبھی اس کالم کو لکھنے سے پہلے عیاں ہوئے تھے؟

☆ یہ تو کچھ زیادہ ہی تگڑا سوال کر دیا آپ نے! بات تو یہ بھی سچ ہے کہ اس کالم کو لکھنے سے پہلے مزاحیہ انداز میرے اندر پیدا ہو چکا تھا اور بینٹ ہوٹل جہاں تقریباً روز ہی شام کو مخدوم محی الدین سمیت تمام ادباء وشعراء جمع ہوتے تھے، وہاں میں بھی جایا کرتا تھا اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میری باتوں پر لوگ اچانک ہنس دیا کرتے تھے اور ان لوگوں کے منھ سے یکسر واہ نکل جاتی تھی۔ ان میں سے کچھ کہتے بھی تھے کہ تم اچھا مزاح لکھ سکتے ہو لیکن کبھی تحریری صورت میں مزاح لکھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔

O آپ کب لکھتے ہیں، کیسے لکھتے ہیں؟ کوئی خاص وقت یا موڈ؟ ذرا تفصیل سے بتائیں؟

☆ ارے صاحب! سب کچھ رواں دواں لکھا ہے۔ کبھی پلان نہیں کیا۔ لکھنے کیلئے چونکہ شروعات اخبار کے کالم سے ہوئی تھی اس لئے ڈیڈ لائین پر لکھنے کی عادت شروع ہی سے پڑ گئی۔ لکھنے کے بعد اتنی فرصت کبھی نہیں ملی کہ اس کی نوک پلک درست کرنے کی نوبت آئے۔

بات یہیں تک پہونچی تھی کہ اندر سے آواز آئی کہ کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ مجتبیٰ صاحب کے گھر کے ڈرائنگ روم کے دائیں طرف لگے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے داہنی طرف دیوار پر اچانک میری نگاہ پڑی جہاں پر انہیں نوازے گئے پدم شری کی سند فریم کی ہوئی آویزاں تھی۔ تھوڑی دیر ہم نے اسے غور سے دیکھا۔ خاصی دھول جمع ہو چکی تھی اس پر۔ مجتبیٰ صاحب کے ساتھ ہم اندر داخل ہوئے۔ بیگم مجتبیٰ حسین نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ روایتی حیدرآبادی بریانی اور بگھارے بیگین اور خوبانی کا میٹھا۔ دسترخوان سے اٹھتی حیدرآبادی پکوانوں کی خوشبو کے درمیان مجتبیٰ صاحب کی بیگم ناصرہ اور ان کی بہو بھی گفتگو میں شامل ہوگئیں۔ مجتبیٰ صاحب کے نواسے ان کے پوتے، بیٹے بیٹیاں کیا کرتے ہیں۔ کہاں رہتے

ہیں، کون ملازمت میں ہے؟ کون نوکری میں ہے۔کون کتنا ذہین ہے۔کون کس عہدے پر ہے وغیرہ۔اس تفصیل کے درمیان مجتبٰی صاحب نے اپنے ایک نواسے کے بارے میں بتایا کہ وہ سائبر ٹیکنالوجی کا ماہر ہےاور گوگل میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہے۔ہم سے رہا نہ گیا، دبی زبان میں منھ سے نکل ہی گیا کہ ان لوگوں میں سے کس نے اردو پڑھی ہے؟ جواب میں مجتبٰی صاحب کی ہی گمبھیر آواز آئی کہ نہیں!

ظہرانہ ختم ہوا، ہاتھ دھونے کیلئے واش روم کی طرف بڑھے تو شیشے کے کواڑ والی ایک الماری پر نگاہ پڑی۔انعامات و اعزازات کی شیلڈ، اسناد اور تمغوں سے بھری ہوئی اس الماری کا حال بھی تقریباً ویسا ہی تھا جیسا بیٹھک میں لگے پدم شری ایوارڈ کے فریم کا۔مجتبٰی صاحب بولے، ارے یہ ہی کیا ان کے علاوہ بھی تمام انعامات ادھر ادھر بند پڑے ہیں۔ارے صاحب! گھر میں جگہ ہی اب کہاں ہوتی ہے۔بیٹھک میں واپس آ کر بات چیت کا سلسلہ پھر چل پڑا۔مجتبٰی صاحب کو ملنے والے انعامات واعزازات وغیرہ سے بھری الماری چونکہ ذہن کے کاریڈور سے ہٹ نہیں رہی تھی۔اس لئے ہم نے بات چیت کا منسلک سلسلہ ایوارڈ ہی سے شروع کی۔

O یوں تو آپ کسی انعام و اعزاز کے محتاج نہیں لیکن پھر بھی مناسب ہوگا کہ آپ اپنے پہلے ایوارڈ کے بارے میں بتائیں۔مجتبٰی صاحب اس سوال پر خاصے کسمسائے، ہلکا سا پہلو بھی بدلا اور بولے

☆ اردو میں پہلا ایوارڈ 1984ء میں اس وقت کی وزیراعظم ہند مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں ملا۔لیکن صاحب! کیا عجیب مذاق ہے کہ سب سے پہلا ایوارڈ تو مجھے 1980ء میں اُڑیا ادب کی ایک انجمن سرس ساہتیہ سمتی نے ''ہاسیہ رتن'' کے طور پر دیا تھا۔

O یہ تو بڑا وضاحت طلب معاملہ ہے۔

☆ ہاں صاحب! ہے تو لیکن کیا کیجئے۔ایسا ہی ہوا ہے۔میں نے لکھنا تو اردو میں ہی شروع کیا، اردو ہی میری زبان ہے اور کبھی سوچا بھی نہیں کہ کسی اور زبان میں لکھیں گے کیونکہ پروفیشن کے طور پر نہیں بلکہ عقیدہ اور مسلک کے طور پر اردو مزاح لکھا۔یہ بھی عجب مذاق ہے کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مزاح نگار بنوں گا لیکن میرے ساتھ ایسا ہو گیا۔اسی ہوجانے میں یہ بھی ہوگیا کہ اردو میں ہم نے جو کچھ لکھا اس سے جو ہمیں پذیرائی ملی وہ تو ملی ہی، میری تحریروں کو ہندی کے مشہور رسالے ''دھرم یگ'' میں شائع کیا جانے لگا اور وہاں سے ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونے لگا۔اسی کا نتیجہ تھا کہ اڑیا کے مشہور طنز و مزاح نگار فتورانند میرے مداح ہوگئے۔ 1980ء میں کٹک میں دوروزہ جشن ہوا جس میں مجھے بڑی عزت و احترام سے بلایا گیا اور اس ایوارڈ سے نوازا گیا۔میرے لئے حیرت ناک ہے کہ اڑیا میں میری تحریروں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

O اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی کیا آپ کو ایوارڈ وغیرہ دیئے گئے؟

☆ تلگو میں مضامین بہت چھپے لیکن کوئی کتاب نہیں چھپی، ہندی میں چھ سات کتابیں چھپیں۔راجیندر یادو نے ''آتم ترپن'' میں شامل کیا اور لکھنا شروع کیا تو دوسال تک لکھا۔اسی طرح ہندی کے دوسرے مشہور رسالے، ساپتاہک ہندوستان، میں بھی کافی عرصہ ہماری تحریریں ترجمہ ہوکر چھپتی رہیں۔فی الحال ''گیانو دئے'' میں چھپتی رہی ہیں۔پنجابی، گجراتی تحریریں ادھر ادھر شائع ہوتی رہیں۔زندگی نے اتنا موقع نہ دیا کہ ہم ان کو یکجا کر پاتے جو کچھ جو لوگ بتا دیتے تھے کہ فلاں جگہ یہ چھپا ہے، فلاں جگہ وہ چھپا ہے، وہی سب ذہن میں محفوظ ہے۔وہی بتا سکتا ہوں۔

O آپ نے اچانک حیدرآباد کو الوداع کہہ دیا تھا یا کوئی باقاعدہ پلان تھا دہلی ہجرت کا؟

☆ اب وہ تو ایک اتفاق تھا کہ 1966ء میں زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے ہم نے اردو مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس منعقد کی تھی جس کی صدارت کیلئے کرشن چندر کو مدعو کیا گیا اور اس کا

افتتاح مخدوم محی الدین نے کیا۔ پورے ہندوستان سے لوگوں نے اس میں شرکت کی اور یہ خوب کامیاب رہی۔ اس کانفرنس میں کرشن چندر سے ہوئی ملاقات ہی دہلی جانے کا سبب بنی۔ اس کے بعد غالباً 1968ء کی بات ہے کہ سرشر نگار سنسد میں مجھے شامل ہونے کا موقع ملا اور اس میں جب ہم نے ایک خاکہ پڑھا تو میری دھوم مچ گئی۔ خوب پذیرائی ہوئی۔ اس محفل میں ''دھرم یگ'' کے ایڈیٹر کنہیا لال نندن سمیت تمام لوگ بھی موجود تھے اور وہاں سے لوگوں نے مجھے پہچاننا شروع کر دیا۔ حالانکہ ہندی میں ہماری تحریریں پہلے ہی سے چھپنے لگی تھیں۔ کرشن چندر اور کنہیا لال نندن کی ایما پر ہی میں دہلی پہنچا اور وہاں ملازمت اختیار کر لی۔ دہلی پہنچ کر زندگی نے دوسری مرتبہ زبردست کروٹ بدلی۔ اردو تو اردو ہندی والوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہمیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہم کب کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ حد تو یہ ہے کہ خوشنونت سنگھ جیسا کروفر والا ادیب بھی ہمارا گرویدہ ہو گیا۔ بھلا ہو لکشمی چند گپتا جی کا جنھوں نے میری تحریروں کو اردو سے ہندی میں ترجمہ کر کے ''دھرم یگ'' میں شائع کیا اور مجھے تمام دوسری زبانوں کے تخلیق کاروں اور قلمکاروں سے روشناس کروا دیا۔ یہ دہلی کا ہی کمال تھا کہ جاپان جانے کا موقع فراہم ہوا۔ ''جاپان چلو جاپان چلو'' کے شائع ہونے کے بعد تو پھر زندگی نے کبھی پلٹ کر پیچھے دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہندی والوں نے وہ پیار دیا، اتنا لکھوایا اور اتنا چھاپا کہ ہم کو زیادہ تر لوگ ہندی کا ہی سمجھنے لگے تھے۔ اب بھی ہندی میں پڑھنے والے سینکڑوں لوگوں کے فون آتے ہیں۔ ہندی کے سارے بڑے ایڈیٹرز میری تحریروں کو جب تب چھاپتے رہتے ہیں اور یہ سب دہلی پہنچنے کے بعد ہی ہوا۔ میرے 35 سالہ دہلی قیام کے تمام قصے اور کئی انٹرویو کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دہلی میں ملنے والے کئی لوگوں پر خاکے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب مزید بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

○ کیا آپ نے کوئی کتاب دہلی کے نام معنون کی ہے؟

☆ نہیں! لیکن ہر جگہ دہلی کا ذکر کیا، ہزاروں مرتبہ، ہر کالم میں، ہر خاکے میں ذکر کیا کہ دہلی میں ہی مجھے سب سے زیادہ شہرت ملی۔ دہلی نے وہ سب کچھ دیا جو کسی نے نہیں دیا، حیدرآباد نے تو مجھے صرف طنز و مزاح لکھنے کی اجازت دی تھی جو کچھ ملا وہ دہلی سے ہی ملا۔ عزت، دولت، شہرت سب دہلی سے ملی۔ دہلی کا میں اپنے آپ کو بہت مقروض مانتا ہوں، وہاں جو میرے پاس اسکوٹر تھا جس پر تمام بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو بٹھا کر میں ادھر ادھر جایا کرتا تھا۔ ان سب یادوں کو ''اسکوٹر کی یاد میں'' میں نے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

○ کیا یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریروں میں حیدرآباد کی اردو کی جھلک بالکل نظر نہیں آتی؟

☆ کہہ سکتے ہیں آپ، لیکن دراصل بچپن ہی سے میں اساتذہ کا کلام اور مشاہیر کی اردو کتابیں پڑھتا آیا تھا، زبان میں پختگی، مجھے نہیں پتہ کہ کب آ گئی مگر محسوس ہوتا ہے کہ ابتداء میں ہی آ گئی تھی لیکن ایسا بھی نہیں کہ حیدرآباد کی اردو سے میری تحریریں مبرا رہی ہوں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ کئی جگہ ہم نے حیدرآباد کے مقامی الفاظ کا برمحل استعمال کیا ہے۔

شام ہو گئی تھی اور مجتبیٰ صاحب کی ٹہل کا وقت ہونے والا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اب چلنا چاہیئے کیونکہ ان کی روز شام کی اس ایکسرسائز میں مجھے مخل نہیں بننا چاہیئے۔ لہٰذا اگلے دن ملاقات کے وعدے کے ساتھ الوادع لی۔ واپس ہوٹل آیا، رات میں ہوٹل کے ہی ایک مخصوص نظام ریستوراں میں حلیم کھائی تو ساتوں طبق روشن ہو گئے اور شب بخیر کی جگہ حیدرآباد کا شکریہ ادا کر کے سو گئے۔

پروفیسر بیگ احساس کے توسط سے اگلے دن حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں اردو ریسرچ اسکالرس کے ساتھ ایک ملاقات طئے تھی۔ اس میں ''نیا دور'' اور اتر پردیش میں اردو کے حالات پر ان اسکالرس سے انٹریکٹ کرنا تھا لیکن سابق وزیراعظم ہند اٹل بہاری واجپائی جی کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اس ناگہانی کے سبب حیدرآباد سمیت پورے ملک میں رنج والم کی لہر دوڑ گئی۔ لہٰذا سارے طئے

شدہ پروگرام منسوخ کردیئے گئے اور ہمیں یو پی میں اردو کے حالات بیان کرنے سے بھی چھٹکارا مل گیا لیکن سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے ۔مجتبٰی صاحب سے بات چیت کی جائے یا پھر کچھ اور، تو فال یہ نکلا کہ حیدرآباد گھوما جائے ۔مجتبٰی صاحب کو فون کیا کہ آج چونکہ ہم سب سوگوار ہیں اس لئے کوئی کام نہیں کریں گے۔ پھر ہم چل دیئے حیدرآباد گھومنے، اولا کرنے کے بجائے ہم نے آٹو کیا۔ بنجارہ ہلز اور جوبلی ہلز کی چڑھتی اترتی خوبصورت سڑکوں کے اردگرد خوبصورت سجی سجائی دکانوں اور اپارٹمنٹ کے پس پشت خوبصورت لینڈ اسکیپ۔حیدرآباد کی اس قدرتی خوبصورتی کی تعریف کئے بغیر بات نہیں بنتی ۔ یہ دیدہ زیب اور خوبصورت مناظر دیکھتے دیکھتے ہائی ٹیک سٹی پہنچ گئے ۔حیدرآباد کا یہ حصہ جدید ہندوستان کے ترقی یافتہ خواب کی تعبیر کے مماثل ہے۔ یہاں سے ہندوستانی شہریوں کو تھوڑی دیر کیلئے ہٹادیا جائے اور اس خطے پر ڈھیر سارے فرنگی اتار کر اس جگہ کا فوٹو لیا جائے تو کوئی پہچان ہی نہیں سکتا کہ یہ ہندوستان ہے یا یورپ ۔ یہاں پہنچ کر ہندوستانی شہریوں کا یہ کمال ہمیں فخر سے بھر دیتا ہے۔سب کچھ بن چکا ہے سینکڑوں کمپنیاں چل رہی ہیں ، نہ جانے کیا کیا ہورہا ہے ۔تکنیکی سیاروں (سیٹلائٹس) سے بازگشت کے منظّم آلات سے لیس اس ہائی ٹیک سٹی میں اب بھی جدھر نگاہ ڈالو ایک اونچی عمارت کے پشت میں کوئی تعمیر چل رہی ہے ۔یہی راستہ جب آگے بڑھتا ہے تو مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی تک پہنچتا ہے اور آگے قلی قطب شاہ کے مقبرہ تک جاتا ہے لیکن یہاں تک آتے ہوئے ہم نے بنجارہ ہلز اور جوبلی ہلز کے اطراف اس قدر قدرتی سبزہ زار سمیت اتنا کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ ذرا بھاری پن آ گیا تھا۔اچانک فون کی گھنٹی بجی، الہ آباد سے اسرار گاندھی، یہ سن کر کے کہ میں حیدرآباد میں ہوں، انہوں نے حیدرآبادی بریانی کی شان میں وہ، وہ قصیدے پڑھے کہ بھاری پن غائب ہوگیا اور بھوک جاگ گئی ۔ وہ یوں گویا تھے کہ دم کی ہوئی حیدرآبادی بریانی کی دیگوں سے بھرا ایک ہوائی جہاز روزانہ دبئی جاتا ہے۔ جناب! یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے اور آپ کو بتاؤں کہ عرب ممالک میں رہنے والے حیدرآباد کے تمام لوگ اس بریانی کے لئے دو تین مہینے پہلے بکنگ کراتے ہیں تب ان کا نمبر آتا ہے ۔ہم نے پوچھا، اس کی تصدیق کیسے ہوگی؟ آپ کو کیسے معلوم؟ جواب میں بولے: ارے بھئی! اخبار میں چھپا تھا، میں نے پڑھا ہے ۔ میں نے اس بحث میں پڑنے کی مزید گنجائش نہیں سمجھی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے لیکن بھوک تو لگ ہی گئی تھی حیدرآباد کی بریانی کے نام پر ۔ اسرار گاندھی نے ہی ہمیں وہیں تھوڑی دور پر موجود پیراڈائس ریستوراں جانے کی صلاح دی، پہنچے تو نمبر آنے میں تھوڑا سا وقت لگا، بریانی آئی تو اس میں چکن کی اتنی بڑی بوٹی نکلی جتنی اپنے وہاں بڑے کی بوٹی بھی نہیں ہوتی ہے۔

اپنے لکھنو کی بریانی کو یاد کر کے اس بریانی کو کھاتے ہوئے بار بار ذہن میں ایک ہی سوال آرہا تھا کہ حیدرآباد کی بریانی اتنی مشہور کیونکر ہے؟ اپنے لکھنو میں بریانی کے ساتھ دہی لہسن سے بگھرا ہوتا ہے تو یہاں کے وہی میں ادرک کا غلبہ ہوتا ہے ۔لکھنو کی بریانی میں کیوڑے کے ساتھ کھانے والے عطر اور الائچی کے مرکب میں جاوتری اور بھنی پیاز شامل ہوتی ہے اس کی جگہ حیدرآباد کی بریانی میں بڑی الائچی اور کھڑے گرم مسالے پیس کر ڈال دیئے جاتے ہیں اور دم لگاتے وقت دہی بھی چھڑک دیا جاتا ہے جس سے ایک مخصوص قسم کی کھٹاس وہاں کی بریانی میں پیدا ہوجاتی ہے جبکہ لکھنو کی بریانی کیوڑے اور عطر سے مہک رہی ہوتی ہے ۔ حیدرآباد کی بریانی کا چاول ضرور بڑا بڑا ہے لیکن کچھ زیادہ ہی بڑا نہیں ہے کیا! اس کے باوجود یہ اتنا خالی خالی کیوں ہے؟ مسالے کیوں نہیں لپٹے ہیں اس سے؟ لکھنو کی بریانی کی دیغ کھلتی ہے تو یخنی کی پرتیں نظر آتی ہیں اور اسے کاٹنے کا فن بھی سب کو نہیں آتا لیکن حیدرآباد کی بریانی کی یکسانیت ہی اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔اس لئے اسے کھانے میں بہت زیادہ تزک واحتشام کی ضرورت نہیں ہے ۔لکھنو کی بریانی اپنے آپ میں مکمل

ڈش ہے۔ جب کہ حیدرآباد کی بریانی کے ساتھ بگھرے بیگن، قمی اور ماہی کباب کا بھی جوڑ ہے۔ بریانی کی طرح لکھنو کے کباب کو بھی ایک انفرادیت حاصل ہے۔ان کیلئے گول توے پر سکنے والے کاغذی پراٹھے کافی ہیں۔

بھلا ہو اسرار گاندھی کا کہ ان کے مشورے پر ہم نے ہائی ٹیک حیدرآباد کی بریانی کا ذائقہ لے ہی لیا۔ ادھر ادھر ٹہلنے، ہائی ٹیک سٹی کی سڑکوں پر یوں ہی مٹرگشتی کرتے کرتے میری نگاہ کئی ایسے ریستوراں پر گئی جو عربی نژاد تھے۔اس طرح کے ریستوراں ہم نے دلی میں بھی نہیں دیکھے ہیں۔اس ہائی ٹیک خطہ میں اب تک ہم کم سے کم پان کی چار پانچ دکانیں دیکھ چکے تھے جن میں بیٹھے ہوئے دکانداروں کے سروں پر دو پلی ٹوپی موجود تھی۔ تھکان نے جسم کو شل کرنا شروع کیا تو ہم آٹو لے کر واپس ہوٹل آ گئے۔

اگلے دن دو پہر بعد ہم پھر پہنچ گئے مجتبیٰ صاحب کے گھر اور بات چیت آگے بڑھانا چاہ ہی رہے تھے کہ مجتبیٰ صاحب اپنے اور اٹل بہاری واجپائی جی سے اپنے رشتوں کی بات کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ آج یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں چھڑی لے کر چلتا ہوں، ٹھیک سے چل نہیں پاتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ اٹل جی کے گھٹنوں کا آپریشن دہلی کے ایمس میں ہونے والا تھا۔ساری تیاری مکمل ہو چکی تھی جو گھٹنے اٹل جی کو لگائے جانے تھے وہ بھی آ چکے تھے کہ عین وقت پر یہ سرجری ٹال دی گئی۔ میں بھی گھٹنے بدلوانے والوں کی لائن میں تھا۔جس ڈاکٹر کو اٹل جی کا آپریشن کرنا تھا وہ میرا بھی مداح تھا۔ جب اٹل جی کا آپریشن منسوخ ہو گیا تو اس نے کہا، آیئے! وہ گھٹنے میں آپ کو لگا دیتا ہوں اور دیکھئے کہ میں آج تک کس حال میں ہوں۔اپنے ساتھ ہوئی اس مسخری کو میں نے (اٹل بہاری کے سلسلہ میں تحریر کردہ خاکہ) میں لکھا ہے اور کیا بتاؤں، پڑھ لیجئے گا۔

مجتبیٰ صاحب! یہ بتایئے کہ طنز و مزاح میں آپ کا رول ماڈل کون ہے یا یوں کہ آئیڈیل کون ہے؟ کس سے سب سے زیادہ متاثر ہیں؟

مارک ٹوئن ہمارا قابل قدر اور قابل احترام مزاح نگار ہے۔اس کے یہاں جو طنز ہے مزاح کی جو شائستگی ہے، اس کے اندر جو عجز ہے، وہ اور کہیں نہیں ملتا۔ اس کی تقلید شاذ و نادر ہی ہو پائی۔ وہ بہت بڑا طنز و مزاح نگار تھا۔اس کے جیسا دوسرا کوئی نہیں پیدا ہوا۔

O اردو میں اگر بات کی جائے تو!

☆ بلاشبہ مشتاق احمد یوسفی

O چلئے ٹھیک ہے۔ مارک ٹوئن اگر سب سے عظیم طنز و مزاح نگار ہے تو اس کے بعد کس کا نمبر آتا ہے؟

☆ پی جی وڈ ہاؤس، افسوس! کہ پی جی وڈ ہاؤس کی کسی بھی تحریر کا اردو یا ہندی میں ترجمہ موجود نہیں ہے۔ غالباً کوئی کر ہی نہیں پایا۔ اتنا سٹل ہے اس کا لکھا ہوا کہ ہر کوئی سمجھ ہی نہیں پاتا ہے، اس کا مزاح پیچیدہ کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی کم بڑا مزاح نگار نہیں ہے۔اسے پڑھنا چاہیئے۔اس کا اسٹائل بڑا پیارا ہے جیسے مارک ٹوئن اپنے انداز کا اچھوتا مزاح نگار ہے ویسا ہی پی جی وڈ ہاؤس بھی ہے۔

O طنز و مزاح کے علاوہ ادب میں آپ کس سے متاثر ہیں یا کون آپ کا پسندیدہ ہے؟

☆ ارے صاحب! بڑی لمبی فہرست ہے۔ کہاں تک بتاؤں۔ ابتداء میں روسی ادب سے بہت متاثر ہوا، بہترین ادب ہے یہ۔ ٹالسٹائے، چیخوف کے علاوہ اور بھی ادیبوں کو پڑھا لیکن چیخوف کے یہاں طنز بھی ملتا ہے۔ جہاں تک اُردو کا سوال ہے سبھی کو پڑھا۔ اردو میں ابتداء میں تو طنز و مزاح کو اولیت دی جاتی تھی۔سب سے اعلیٰ ادب تسلیم کیا جاتا تھا اور ادب عالیہ کے زمرے میں اس کا شمار کیا جاتا تھا۔ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں اسی ماحول کے پروردہ ایک سے ایک بڑے طنز و مزاح نگار بھی پیدا ہوئے اور ہمارے عہد کا سب سے بڑا طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

O مشتاق احمد یوسفی غالباً واحد مزاح نگار ہیں جنہوں نے مزاحیہ

اندازمیں اپنی خودنوشت بھی لکھی؟

☆ آپ کا خیال صحیح ہے۔ یہ واحد مزاحیہ سرگزشت ہے۔ یہ ایک لاجواب سوانح عمری ہے جس میں انہوں نے تقسیم ہند سے لے کر بینک کی ملازمت تک کے واقعات لکھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کن نامساعد حالات میں اپنی زندگی گزاری۔

○ یوسفی کی تحریریں خواص کیلئے ہیں۔جب تک قاری اردو ادب کی تاریخ سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتا ان کی تحریر سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔جگہ جگہ حالؔی، شبلی، ابوالکلام آزاد وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں۔ پھر ان کی عوام میں مقبولیت کی کیا وجہ ہے؟

☆ یوسفی بڑے اہتمام سے لکھتے تھے۔شاید ہی کسی مزاح نگار نے اتنے منظّم انداز میں لکھا ہو۔ایک ایک جملے کو دس دس بار لکھتے تھے۔اس کے بعد دوبارہ پڑھتے تھے، کچھ دن رکھ دیتے تھے۔اس کے بعد پھر پڑھتے تھے اور مناسب تبدیلیاں اور ترمیم کرتے تھے۔ نہ صرف وہ لفظوں کا بلکہ فل اسٹاپ اور کاما تک کا خیال رکھتے تھے۔ یوسفی کی تحریروں میں جتنے الفاظ استعمال ہوئے وہ گہری سوچ بچار اور غور و خوص کا نتیجہ ہے۔ایسا زیرک مزاح نگار اردو ادب میں کوئی اور نہیں ہے۔

○ میں نے عوام میں مقبولیت کی وجہ پوچھی تھی؟

☆ یوسفی کا اسلوب آسان نہیں ہے۔ وہ بہت ہی سنجیدہ قرأت کا مطالبہ کرتا ہے۔ یوسفی کے اندر علم کا خزانہ تھا، وہ نہ صرف اردو بلکہ گجراتی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا سوچ سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔ان کے جملوں کی ساخت کچھ ایسی ہوتی تھی کہ سیدھے دل پر اثر کرتی تھی۔ ہر پیراگراف بار بار پڑھنے کے بعد ہی صحیح لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر جملے اقوال کے روپ میں یاد رکھے جاتے ہیں۔خواص کے علاوہ عوام کی دلچسپی کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔

○ آپ کی ہر اردو تحریر کا ہندی میں ترجمہ ہو گیا، یوسفی کی مزاحیہ تحریروں کا ترجمہ ابھی تک ہندی میں کیوں نہیں ہو پایا؟

☆ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ یوسفی صاحب بڑے تزک و احتشام سے لکھتے تھے، پلاننگ کے ساتھ لکھتے اور لکھنے کے بعد ان کے وہاں تصیح کا عمل بھی چلتا رہتا اور اردو کے روایتی محاوروں کا وہ اپنی تحریروں میں جس پس منظر کے ساتھ استعمال کرتے تھے، اسے کسی دوسری زبان میں تب تک تبدیل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اردو کے اس پس منظر سے مکمل واقفیت حاصل نہ کر لی جائے۔

کل کی طرح آج پھر شام ہو گئی اور تقریباً وہی وقت ہو گیا جب مجتبیٰ صاحب کو روز سیر پر جانا ہوتا ہے۔سیر کیا اسے کار سیر کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ وہ کہیں نہیں جاتے ہیں، وہ یوں ہی حیدرآباد کی شاہراہوں سے گزر کر لوٹ آتے ہیں۔لوٹنے کے بعد آدھا گھنٹہ چھڑی کے سہارے واک کرتے ہیں۔ ان کے اس معمول نے ہی بقول ان کے انہیں بڑھاپے میں بھی تر و تازہ بنائے رکھا ہے۔دراصل یہی ہے ان کے جسم کی ضرورت اور یہی ہے ان کی دوا جو انہیں ابھی تک توانا بنائے ہوئے ہے۔

اسی شام کو حیدرآباد کے مشہور نظام کلب میں "مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری" پر ڈاکٹر گل رعنا کی کتاب کی رونمائی کی تقریب طئے تھی۔ہم لوگ وقت پر پہنچ گئے۔مجتبیٰ صاحب بھی وقت سے ذرا پہلے ہی آئے، گل رعنا اور ان کے شوہر عبدالحق نے بڑھ کر مجتبیٰ صاحب کا خیر مقدم کیا۔ باقی احباب بھی وقت پر موجود تھے۔ رونمائی کی تقریب شروع ہونے کو تھی لیکن فضا بھاری تھی۔تابندہ تہذیبی اثاثے سے بھرپور نظام کلب کی رونق بھی اس فضاء کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔اٹل بہاری واجپائی کی رحلت شاید نظام کلب کے شاندار ماضی پر بھاری پڑ رہی تھی۔زیادہ تر مہمانوں نے پھولوں کے گلدستے سے پرہیز کیا تھا کہ قومی غم پر کہیں آنچ نہ آ جائے۔

جلسے کی نظامت ڈاکٹر شجاعت علی کے ذمہ تھی۔انہوں نے بڑھ کر مجھ سے بڑی گرمجوشی سے اپنی یو پی کے رشتوں کے بارے میں بتایا۔جلسہ شروع ہوا تو ایک ایک کر کے لوگوں کو ڈائس پر آنے کی دعوت شجاعت صاحب دینے لگے۔سب نے کرسیاں سنبھال

لیں تو شروع ہوا پھول کی جگہ پھل کی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں پیش کرنے کا سلسلہ۔گل رعنا کے شوہر عبدالحق اور دوسرے احباب نے شال کے ساتھ اسٹیج پر موجود مہمانوں کو پھلوں کی ٹوکری پیش کی ، چہ می گوئیوں سے سمجھ میں آیا کہ اٹل جی کے انتقال کے سبب نظام کلب نے اس شرط پر ہی اس جلسہ کی اجازت دی تھی کہ ایسا کچھ نہ کیا جائے کہ تقریب کی خوشیاں کسی بھی طور پر عیاں ہونے لگیں ۔اس تنبیہ کے باوجود کچھ لوگوں سے رہا نہ گیا اور وہ پھولوں کا گلدستہ گل رعنا کیلئے لے ہی آئے ۔ بہر حال اس کے بعد گل رعنا کی تصنیف ، مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری، پیکٹ سے نکالی گئی۔مجتبیٰ حسین، زاہد علی خان، بیگ احساس سمیت سبھی نے کتاب کی رونمائی کی رسم ادا کی۔

اس کے بعد ڈاکٹر شجاعت علی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے سب سے پہلے اس خاکسار کو ہی دعوت سخن دے دی جب کہ ابھی چند لمحہ پہلے ہی انہوں نے راقم الحروف کو اپنے استقبالیہ خطبہ میں بطور مہمان خصوصی متعارف کرایا تھا اور بیک ڈراپ پر بھی میرے نام کے نیچے مہمان خصوصی تحریر تھا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا مجھے افتتاحی کلمات پیش کرنا پڑیں گے۔

بہر حال !مرتا کیا نہ کرتا، یہ سوچ کر کہ رسم دکن شاید یہی ہو ، میں پوڈیم کی طرف بڑھا اور جو کچھ سوچا تھا اس سے میرا پانچ سات منٹ مجتبیٰ صاحب کیلئے جو یاد آتا رہا کہا لیکن بطور خاص یہ ضرور کہا کہ قلی قطب شاہ، مخدوم محی الدین، واجدہ تبسم اور مجتبیٰ حسین کا یہ حیدرآبادی سلسلہ ختم نہیں ہونا چاہیئے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسر اشرف رفیع ، پروفیسر فاطمہ پروین، شاذ تمکنت کے بھائی امتیاز الدین وغیرہ نے اظہار خیال کیا اور حتمی طور پر یہ بات سامنے آئی کہ مجتبیٰ حسین کی تحریروں پر حیدرآباد سے زیادہ اتر پردیش اور بہار میں تحقیقی کام ہوا ہے اور ہو بھی رہا ہے ۔ان کی مزاح نگاری پر پی ایچ ڈی اور ایم فل اتر پردیش، دہلی اور بہار میں ہی سب سے زیادہ ہوئے ہیں۔مجتبیٰ حسین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنی تحریروں میں خواتین کی نمائندگی سے پرہیز کیا ہے

حیدرآباد کے معروف اردو روزنامہ ''سیاست'' کے مدیر جناب زاہد علی خان نے مجتبیٰ حسین صاحب کو ''سیاست'' کے پہلے قاری ہونے اور ''سیاست'' سے برسوں وابستہ رہنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے بڑی محنت سے یہ ذمہ داری نبھائی۔انہوں نے کہا کہ حیدرآباد کو یہ فخر ہے کہ یہاں مجتبیٰ حسین جیسے قدآور مزاح نگار موجود ہیں۔اپنی تقریر کے دوران انہوں نے راقم الحروف کی طرف طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ تلنگانہ حکومت نے اردو کے بجٹ میں جو اضافہ کیا ہے وہ ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے۔

اپنے صدارتی خطبہ میں معروف افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس نے مجتبیٰ صاحب کی تحریروں کے حوالے سے ایک مختصر لیکن جامع تقریر میں مزاح پیدا کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین کو اردو مزاح نگاری کا امیتابھ بچن قرار دیا اور یوسفی صاحب کو دلیپ کمار۔

آخر میں مجتبیٰ صاحب کے سامنے جب مائک رکھا گیا تو انہوں نے سب سے پہلے گل رعنا کے شوہر عبدالحق کو عالمی فوٹو گرافی کا عبدالحق کہا اور گل رعنا کے تئیں اپنی شفقت کا اظہار کرتے ہوئے تعریفی الفاظ میں کہا کہ اس کتاب سے پہلے بھی کئی کتابیں ان پر شائع ہو چکی ہیں اور انہیں خطرہ یہ ہے کہ ان کی کتابوں سے زیادہ کہیں ان پر کتابیں شائع نہ ہو جائیں ۔اپنے مخصوص انداز میں مجتبیٰ حسین نے مصنفہ سے زیادہ ان کے شوہر کیلئے توصیفی کلمات پیش کئے اور جلسہ ختم ہوا۔

بعد از تقریب عشائیہ میں حیدرآبادی بریانی کے ساتھ مہمانوں نے دوسرے لوازمات کا لطف لیا۔میں نے موقع غنیمت جانا اور زاہد علی خان سے پوچھا کہ تلنگانہ اردو اکیڈیمی کا بجٹ کتنا ہے ۔ایک لمحہ کے تاسف کے ساتھ انہوں نے مجھے بغور دیکھا اور کہا کہ یاد نہیں ۔میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ''سیاست'' جیسے معتبر اخبار کے مدیر نے یہ بات کس وثوق سے کہہ دی کہ تلنگانہ اردو اکیڈیمی کا بجٹ ہندوستان کی دوسری تمام اسٹیٹ اکیڈیمیوں سے زیادہ ہے ۔

دوران عشائیہ جیسی چپقلش، چہ می گوئیاں، گہما گہمی، ہنسی مذاق اور پُر لطف بذلہ سنجی دہلی اور لکھنو کی محفلوں میں رہتی ہے وہ یہاں مفقود تھی۔

اگلا دن حیدرآباد کے قیام کا آخری دن تھا۔ واپسی کی تیاری کرنی تھی اور بچے وقت میں درگاہ قلی قطب شاہ اور سالار جنگ میوزیم دونوں جگہ میں کسی ایک جگہ جانے کی کوشش تھی لیکن وقت کم تھا۔ طئے پایا کہ میوزیم چلا جائے۔ اس کی شان وشوکت حیدرآباد کے شاندار ماضی کے قصیدے کہہ رہی تھی۔ نظام کے خاندان نظام کی آسائشوں، عیش وآرام کے ساتھ ان کے دور حکومت میں دکن کی ادبی، تہذیبی وثقافتی زندگی کی جھلک یہاں بھرپور طریقہ سے موجود تھی۔ نظام نے زبان، ادب تہذیب وتمدن اور دکن کی ثقافت کی ترویج اور ترقی میں کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی تھی۔ یہ یہاں آ کر صاف نظر آ رہا تھا۔ میوزیم کے در ودیوار پر اردو کا غلبہ صاف دیکھا جا سکتا ہے لیکن حیرت یہ بھی ہوئی کہ فن سنگ تراشی کے شاہکار نمونوں کے درمیان یہاں بھی اب کچھ ایسے مجسمے نصب کر دیئے گئے ہیں جن کی موجودگی بصارت پر بار ہے۔ شام کو ہم پھر مجتبی حسین صاحب کے گھر پہنچ گئے کہ چلتے چلتے آج پھر ان سے ملاقات کر لی جائے۔ وہ بھی بڑے جذباتی انداز میں ہم سے ملے۔ اپنی بیگم سے ہمارے لئے چائے بنوائی، چائے پی رہے تھے کہ ہم نے پوچھ ہی لیا کہ

○ مجتبیٰ صاحب! آپ نے کہا کہ آپ نے بھرپور زندگی جی، دوستوں کے درمیان خوب اٹھے بیٹھے، ادھر ادھر آئے لیکن آپ نے اپنی اہلیہ کے بارے میں کہیں کچھ نہیں لکھا کہ انہوں نے کس طرح آپ کو موافق ماحول مہیا کرانے میں مثبت کردار ادا کیا؟

☆ نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے ان کا بارہا ذکر کیا ہے۔ ناصرہ کے بغیر ہمارا وجود نامکمل ہے۔ انہوں نے گھر کو سنبھال رکھا اور بچوں کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسی لئے تو ہم لکھ سکے ورنہ اگر گھر کے جھمیلوں میں ناصرہ نے ہم کو پھنسا دیا ہوتا تو یہ مجتبیٰ حسین آپ کو اس طور پر تو ہرگز نظر نہیں آتا اور یہ ناصرہ ہیں کون؟ یہ دراصل ہماری چچازاد بہن ہوا کرتی تھیں کہ ایک دن ہم نے ان کو اپنی قمیص میں بٹن ٹانکنے کو کیا دیا کہ ان کے گھر والوں نے ان کو ہمیں سے ٹانک دیا۔

تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد ہم نے رخصت کی اجازت چاہی، مجتبیٰ صاحب اور زیادہ جذباتی ہو گئے اور چلتے چلتے ہمیں پھر ایک مرتبہ گلے سے لگایا اور خدا حافظ کہہ دیا۔ حیدرآباد جب آئے تھے جو جیسا موسم تھا ویسا ہی موسم اتنا ہی خوبصورت اتنا ہی خوشگوار اور اتنا ہی سہانا تب بھی ہے جب ہم جا رہے ہیں۔ حیدرآباد کو اس موسم کی مبارکباد!

ہم واپس آئے، ہوٹل سے سامان لیا، اولا پکڑی اور مشہور افسانہ نگار شموئیل احمد کے دروازہ پر دستک دی۔ ایئر پورٹ کے راستے میں ہی ہندوستان کے اس سب سے طویل بارہ کلومیٹر والے فلائی اوور کے پلر نمبر 177 کے پاس ان کی رہائش تھی۔ گذشتہ کئی دن سے حیدرآباد کی بریانی، پتھر کا گوشت، بگھرا بیگن، حلیم، ادرک آمیز رائتہ، قیمی کباب وغیرہ وغیرہ سے معدے کا پتہ نہیں لیکن طبعیت بھر گئی تھی۔ شموئیل صاحب کی بیگم کے ہاتھوں کی روٹی اور لوکی گوشت کھایا تو منہ نے پھر سے شمالی ہندوستان کے ذائقہ کی تجدید کر دی۔ ''لنگی'' سمیت ''گرداب'' کے حوالوں کے ساتھ شموئیل احمد سے خوب باتیں کیں اور ایئر پورٹ کا باقی بچا راستہ پورا کر کے فلائیٹ پکڑی اور لکھنو آ گئے۔

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔ جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

یادیں

نواب اصغر حسین کی یادیں

حیدرآباد میں بیٹھ کر جب ہم اپنے اسفار پر سرسری سی نظر ڈالتے ہیں تو حیدرآباد ہمیں جام جم معلوم ہوتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا ہمارے سامنے ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ان گزرتی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر ہمیں اپنی اندرونی قوت، جذبہ شوق، ذوق جستجو اور فہم جوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔1948ء کے بعد حیدرآباد بدل گیا، اس کی روح بدل گئی اس کے جسم وجان میں روح فرسا تبدیلیاں آ گئیں اس کی علمی ادبی شخصیتیں یا سمٹ گئیں یا گم ہو گئیں یا دنیا بھر میں پھیل گئیں یا پھر یوں کہیے کہ انہیں پھیلنا پڑا۔1954ء کی بات ہے ہماری خاندانی تاریخ میں عجیب نشیب وفراز آئے بچپن کی تعلیم وتربیت کے بعد والد کے ساتھ ساتھ کہاں کہاں جانا پڑا وہ ایک طویل داستان ہے اب تک ہم نے فرانس اور افغانستان کی تو بات کی مگر حیدرآباد سے پہلا فراق تو ہم بھول نہیں سکتے۔حیدرآباد سے ہماری محبت کا اندازہ ہمیں اس پہلے فراق سے ہی ہو سکا۔

1954ء میں والد صاحب (نواب میر معظم حسین صاحب) انگلستان بھیجے گئے اپنی صحت کی باز یافت کے لیے گزرے دنوں کی تلخ یادوں کو بھولنے کے لیے جب وہاں تھے تو UNO کے صدر اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی سرکاری تعلیم کے پروگراموں کی تنظیم کے لیے بحیثیت Minister of Education دعوت دی گئی۔ ہمارے والد نے گونڈوں کے ساتھ اور گجرات کے مختلف قبائل میں جو کام انجام دیئے اس کی بیرونی ممالک میں کافی شہرت ہو چکی تھی جب وہ لندن میں تھے تو انھیں پیرس بلایا گیا کیوں کہ ان دنوں یونیسکو میں ناخواندگی، ان پڑھی اور ابتدائی تعلیم کے پروگرام بن رہے تھے۔ وہ ممالک جن کو ابھی ابھی آزادی ملی نئی نئی آبادیاں ملیں وہ انہیں تعلیمی ترقی وفروغ کے پروگرام کی ذمہ داری دے کر صدر بنانا چاہتے تھے۔ اور UNO کے صدر انہیں سیریا بھیجنا چاہتے تھے مگر ہمارے والد کو اب حیدرآباد اور خاندان اور اہل خاندان کی یاد آ رہی تھی اور انہوں نے پانی کے جہاز سے حیدرآباد کے لیے سفر شروع کیا جب جہاز کراچی میں رُکا تو ایک انہونی ہو گئی پاکستان کی پولیس جہاز پر چڑھ آئی اور والد صاحب کو اترنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پریشان ہو گئے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کا جرم کیا ہے؟ ماجرا کیا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ پولیس والے انہیں پولیس کمشنر آفس لے گئے۔ وہاں پہنچ کر والد صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی انہوں نے دیکھا کہ حیدرآبادی سیول سرویس کے دوست، کچھ منسٹرس وہاں موجود تھے۔ کچھ لوگ میر لائق علی خاں کی طرف سے بھی آئے ہوئے تھے ان کا پیام لائے تھے کہ میر لائق علی خاں انہیں یعنی ہمارے والد کو وزیر تعلیم کا پوسٹ آفر کرنا چاہتے تھے تا کہ وہ ملک جو ابھی ابھی قایم ہوا ہے اس کی تعلیمی بنیاد مضبوط ہو سکیں والد صاحب پریشان ہو گئے کیا کریں؟ کیا نہ کریں؟ ان کی تو تاریخ ساری حیدرآباد سے جڑی ہوئی تھی ان کا خاندان حیدرآباد دکن کا تھا۔ حیدرآباد دکن کی محبت رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔ وہ خود اور نہ ان کے والد نواب رئیس جنگ بہادر نہ ان کے سسرے پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا، ان کا پاکستان جانا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ والد صاحب سے وہاں کے لوگوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ اور وہاں دیکھیے تو جہاز کی روانگی کا وقت قریب ہوتا

جا رہا تھا والد نے ان لوگوں سے کہا۔ میرا سارا خاندان بیوی بچے والد وغیرہ سبھی حیدرآباد میں ہیں ان سے بچھڑے مجھے ایک سال ہو رہا ہے میرا وہاں جانا ضروری ہے وہاں پہنچ کر مشورے اور غور وفکر کے بعد میں آپ کو اطلاع دوں گا بڑی مشکل سے چھٹکارا ملا، جیسے ہی وہ جہاز پر سوار ہوئے انہیں ایک ٹیلی گرام ملا جو پیرس سے تھا جس میں یونیسکو کے صدر نے والد صاحب سے فوراً پیرس آنے کی خواہش کی تھی کیوں کہ لیبیا جو اقوام متحدہ کا ٹرسٹی شپ علمبرداری میں تھا وہاں ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے تعلیمی منصوبے بنانا ضروری تھا۔ اٹالین حکومت جو وہاں تھی اس نے وہاں کچھ نہ چھوڑا تھا۔ لیبیا کے عوام جو مختلف Tribes میں بٹے ہوئے تھے انہیں کچھ معلوم نہیں تھا والد صاحب نے حیدرآباد اور اپنے والد نواب رئیس جنگ بہادر اور پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا سے مشورہ کیا۔ اس زمانے میں سجاد مرزا جو محمد مرزا حسن کے بھائی تھے وہ Deputation پر لیبیا بھیجے گئے تھے انہیں بھی وہاں تعلیم کی ذمہ داری دی گئی تھی حیدرآباد واپس آ گئے تھے۔ وہ ہمارے پڑوسی بھی تھے اور ہمارے نانا کے بڑے دوست بھی تھے انہوں نے (سجاد مرزا) ہمارے والد کو وہاں کے حالات سے واقف کروایا کہا کہ بڑا مشکل مرحلہ ہے وہ ایسا علاقہ ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہے سخت مشکل ہوگی وہاں ریگستان ہی ریگستان ہے وہاں مدرسے قایم کرنا ایک چیلنج ہے۔

اس زمانے میں لیبیا کی آبادی ایک ملین سے کم تھی رہنے سہنے گھر نہیں تھے ٹریپولی جو وہاں کا سب سے بڑا شہر تھا وہ ہمارے خیریت آباد سے بھی چھوٹا تھا۔ ہمارے والد بہت پریشان ہوئے سوچا وہاں جائیں گے تو اہل خاندان کو وہاں رہنے سہنے کی بڑی تکلیف ہوگی۔ وہاں کا ماحول سخت مذہبی تھا۔ پردے کی سختی سے پابندی تھی۔ عربی زبان کے سوا کوئی اور زبان وہاں نہیں چلتی تھی اگر ہماری والدہ کو وہاں بلایا گیا تو ایک چھوٹے سے گھر میں رہنا ہوگا۔ بچوں کی تعلیم کا کیا ہوگا وہاں تو کوئی اسکول بھی نہیں تھا صرف ایک اٹالین مدرسہ تھا اٹالین لڑکوں کے لیے اور ایک چھوٹا سا نیا بنا ہوا مدرسہ عرب لڑکوں کے لیے تھا۔ ہماری والدہ کم عمر تھیں پانچ بچوں کی ماں تھیں۔ والدہ کے سامنے جب یہ مسئلہ رکھا گیا تو انہوں نے جواب دیا ''دیکھیے میں زمانہ حمل میں بھی آپ کے ساتھ جنگل جنگل پھرتی رہی، بنڈی میں، چکارے میں، میانے میں سفر کرتی رہی اس کے بعد تین سال عدالتوں اور سرکاری راہداریوں کے اندھیاروں سے گزرتی رہی پھر چند سال سخت پریشانی میں تو پھر مجھے صحرا اور راجستھان کا کوئی ڈر نہیں سب سے بڑی چیز جو میرے لیے اہمیت رکھتی ہے وہ آپ ہیں۔ آپ کی صحت ہے، آپ کی ترقی، آپ کی کامیابی ہے اب رہے بچے تو ان کی تعلیم کے لیے آپ فکر نہ کریں میں گھر میں ہی ان کی تعلیم و تربیت کر سکتی ہوں۔ یہی کچھ تو مغلوں کے محلوں میں ہوتا تھا۔ ان محل سراؤں میں تعلیم حاصل کر کے ہمارے خاندان سے کتنے ہی لوگ علمی ادبی دنیا میں آئے ترقی پسند خیالات کے لوگ نکلے۔ نہ انہوں نے مدرسوں میں تعلیم حاصل کی نہ کالجوں میں پڑھا۔ والدہ نے والد صاحب کی ہمت افزائی کی تو وہ یعنی والد صاحب حیدرآباد سے پیرس گئے وہاں سے لیبیا۔ والد صاحب کو وہاں کے حالات دیکھ کر عجیب لگا۔ اجنبی لوگ و ملک، باہر کی حکومتوں نے اس چھوٹے سے ملک پر قبضہ کر رکھا تھا۔ انہیں عوام سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ نہ وہاں کی تہذیب سے واقف تھے نہ مذہب سے نہ ان کے مسائل سے وہاں موجود انگریزی عہدیدارو ں نے والد سے ملاقات کی تو انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہاں کے عوام سے دور ہی رہیں ان سے کبھی اپنے خیالات کا اظہار نہ کریں نہ ان سے یعنی لیبیائی عوام سے ہمدردی جتائیں۔ انگریزی عہدہ داروں کی یہ باتیں والد صاحب کو عجیب سی لگیں۔ والد کو یہ معلوم ہوا کہ ایک جرمن Anthropologist آئی ہوئی ہیں جن کا

نام Baron Von Haiman Dorf تھا۔ انہوں نے نظام سابع کے زمانے میں گونڈوں پر کام کیا تھا۔ اب وہ یہاں Sahara کے قبیلوں میں کام کر رہی تھیں۔ وہ خاتون ان قبیلوں کو بالکل نو آباد کار Colonolist کی طرح سے سمجھتی تھیں جیسا اس زمانے کا یونان اپنے Colonies کو سمجھ رہا تھا اور کام کر رہا تھا۔ جب ہمارے والد کو Sahara کو بھیجا گیا تو انہیں ٹریپولی سے اونٹ پر سفر کرنا پڑا جہاں کنویں ملتے پانی ملتا کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاتے۔ ہر چھ مہینے میں ٹریپولی آتے تھے۔ جو قصبہ وہاں انہیں ملتا وہاں رکتے وہاں کے لوگوں سے تبادلہ خیال کرتے انہیں کاغذ، پنسل اور کتابیں دیتے اور ایک استاد ان کے لیے مقرر کرتے تھے وہاں کے مشہور قبیلے تھے ''طوارگ'' اور ''طبو'' میں ان کے پاس ابتدائی نوعیت کی تعلیم کا انتظام کرتے۔ طبو اور طوارگ بڑے لڑاکو اور خطرناک قبیلے تھے وہ فرنچ اور فارن ریجن سے لڑتے تھے اس علاقے بہت کم اجنبی لوگ جاتے تھے جاتے تو پھر واپس نہیں آتے تھے طبو میں مرد بھی اپنے منہ پر دھاٹا باندھتے تھے خواتین چہرہ نہیں چھپاتی تھیں طوارگ میں مرد اور عورت دونوں منہ پر کپڑا باندھتے تھے۔ اس زمانے میں وہاں کے دیہات جیسے غلطہ اور صبحا فرانسیسی قبضے میں تھے وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ میر معظم حسین کیوں ان قبیلوں کو تعلیم دلانے پر تلے ہوئے ہیں کیوں کہ ان Foreigners کا خیال تھا کہ اگر ان قبائل کو پڑھنا لکھنا آ جائے تو ہمیں یہاں سے نکال باہر پھینکیں گے یہی بات ان لوگوں نے والد صاحب کو بھی سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ بھی کہا کہ یہ قبائل اس لائق نہیں کہ اپنے ملک پر خود حکومت کر سکیں۔ والد صاحب یہ سب کچھ سنتے رہے اور وہی کرتے رہے جو انہیں کرنا تھا۔ ان قبیلوں میں رہ کر ان کے ساتھ والد صاحب وقت گزارتے رہے ان کی سیدھی سادی زندگی اختیار کی زمین پر سوتے جو وہ لوگ کھاتے تھے وہی کھاتے تھے مہینے دو مہینے میں اگر گوشت مل گیا تو مل گیا۔ اکثر اس گوشت میں کیڑے پڑے ہوتے تھے وہاں کی گرمی میں ایسا تو ہوتا ہی تھا کنوؤں میں پانی نہیں ہوتا تھا ہوتا بھی تو پانی نہیں بلکہ کیچڑ ہوتا تھا۔ جو بھی پانی ملتا اسے اُبالتے اور استعمال کرتے تھے یورپی عہدہ داروں کو یہ ساری باتیں ناپسند آتی تھیں۔ یہ بھی افواہ اڑادی کہ والد صاحب کمیونسٹ ہیں۔ بہر حال یورپی عہدہ داروں نے بہت کوشش کی کہ یہ کسی طرح وہاں سے نکل جائیں مگر وہاں کے قبیلے اور قبیلوں کے صدور اور جو کوئی لبنانی عہدہ دار تھے وہ سب والد صاحب کی فلاحی اسکیموں سے واقف تھے انہیں پسند کرتے تھے اور ان کی طرف داری کرتے رہے۔ وہاں کا ماحول سخت مذہبی تھا نماز روزے کے پابند لوگ تھے انگریزوں نے والد صاحب سے لیبیائیوں کو بدظن کرنے کے لیے یہ بھی مشہور کر دیا کہ یہ صاحب روزے نہیں رکھتے وہاں تو بچہ بوڑھا عورت مرد سبھی روزہ رکھتے تھے والد صاحب سے پوچھ تاچھ ہوتی تو انہوں نے اپنا قمیص پیٹ پر سے اٹھا کر آپریشن کے نشان بتا دیئے۔ یہ نشان اس وقت کے تھے جب حیدرآباد کی بساط الٹ گئی تھی وہ اور مخدوم وراج کے ساتھ سرکاری مہمان تھے۔ خیر یہ الگ قصہ ہے۔ تو لبنانی عہدیداروں نے سب کے سامنے کہہ دیا کہ السید حسین صوم وصیام معاف'' یہاں والد صاحب کے کارناموں کی شہرت اتنی ہوگئی کہ چند ہی مہینوں میں نیو یارک، جینوا اور فرانس سے میڈیا کے لوگ آئے اور ڈاکومینٹری بنانے کی اجازت مانگی۔ یہاں والد صاحب نے موبائیل لرننگ، موبائیل اسکولس قایم کیے تھے اسی طرح دوسرے نئے نئے ملکوں میں بھی تعلیم پر کام ہونے لگا، جو لوگ مقامی ترقی کے خلاف تھے وہ نا کام ہوتے رہے۔ اب یہ ہوگیا کہ ہمارے والد صاحب کو UNO میں صدر تعلیم بنانا چاہتے تھے۔ سجاد مرزا حیدرآباد سے لیبیا واپس آ گئے اور ایک نیا پوسٹ Chief of Mission Unesco والد صاحب کے لیے خاص طور پر قایم کیا گیا

والد صاحب نے گھر کو ایک ٹیلی گرام بھیجا کہ بچوں کو لے کر یہاں آ جاؤ۔ مگر ہماری ملاقات چھ مہینے میں ایک دفعہ ہوگئی کیوں کہ آپ ٹریپولی میں بچوں کے ساتھ رہیں گی اور میں ایک ہزار کیلو میٹر دور Sahara میں رہوں گا۔ تار ملا تو سب لوگ ہماری والدہ (شہزادی مہر النساء بیگم صاحبہ) کو ڈرانے لگے کہ آپ حیدرآباد چھوڑ کر وہاں کیسے جا سکتی ہیں جب کہ وہ ایک اجنبی ملک میں آپ کو اکیلا رہنا ہوگا۔ وہاں کا ماحول الگ زبان نئی سخت مذہبی پابندی گرمی یہ سب کیسے برداشت کریں گی آپ مگر ہماری والدہ نے ان سب کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ایک بیوی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہر حال میں گزارے خواہ وہ شہر ہو کہ جنگل محل ہو کہ جھونپڑہ میں ضروری جاوں گی'' اب انہوں نے لیبیا جانے کی تیاری شروع کر دی انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ لیبیا میں غربت بہت ہے۔ انہوں نے حیدرآباد کے بڑے بڑے دکانداروں، مالداروں اور امرائے حیدرآباد سے مل کر کپڑے دوائیں وغیرہ فراہم کرنے کی کوشش کی۔ ان کی خواہش پر علاء الدین خاندان، شاہ عالم خاندان، بابو خاں فیملی، فدا علی، قربان حسین، کمال یار جنگ، ولی الدولہ، ظہیر یار جنگ، حبیب جنگ اور وہ تمام لوگ یعنی پرانا حیدرآباد وہ جن کے دروازے ہمارے نانا پر کھلے تھے ان سب سے بے حساب کپڑے وغیرہ جمع ہوگئے۔ اب سوال یہ تھا کہ اتنا سارا سامان لے جائیں کیسے؟ قربان حسین صاحب نے بڑے بڑے صندوق فراہم کیے اور ان سب کپڑے بھر کر بھیجے پانی کے جہاز سے بھیجے گئے۔ یہ سامان ٹریپولی پہنچا تو وہاں سے گاڑیوں اور اونٹوں پر لاد کر Sahara کو سامان بھیجا گیا۔ کپڑے جب وہاں تقسیم ہوئے جو بہت اچھی حالت میں تھے تو لوگ پہن کر بہت خوش ہوئے حیدرآبادیوں اور حیدرآباد کو دعائیں دینے لگے ان کپڑوں کو پہن کر لڑکے لڑکیاں ریگستان میں، پہاڑوں پر خوشی سے دوڑتے پھرتے تو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح ہماری والدہ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ان کا نام مشہور ہوگیا تھا۔

ہماری والدہ اور ہم پانچ بھائی بہن حیدرآباد چھوڑ کر والد کے پاس جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ حیدرآباد سے ہماری یہ جدائی عجیب جدائی تھی خاندان والوں کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ایک جوان لڑکی اپنے بچوں کو لے کر ایسی جگہ جا رہی ہے جس کے متعلق کم معلومات میں اور جو معلومات میں وہ تشویش ناک ہیں اگر خدانخواستہ وہاں کچھ ہوگیا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہم ٹریپولی جا رہے ہیں تو لوگ زادہ راہ کے طور پر کئی کئی چیزیں لا کر دینے لگے اچار، مسالے، چاول، آٹا اور جانے کیا کیا۔ یہ تھا ہمارا محبتوں سے بھرا حیدرآباد اب اس سامان کو لے جانے کا مسئلہ تھا قربان حسین صاحب خاص طور پر لوہے کے صندوق اور پیٹھیاں بنوا کر لائے۔ کپڑوں کے لیے چمڑے کے سوٹ کیس فراہم کیے چمڑے کے وہ سوٹ کیس آج 55 سال بعد بھی ہمارے یہاں محفوظ ہیں۔ آخر حیدرآباد چھوڑنے کا دن آ ہی گیا۔ اتنے سارے لوگ ہمارے گھر آ گئے ٹانگوں میں گاڑیوں میں۔ جیسا بھی ہوسکا بیگم پیٹ ایئر پورٹ اس وقت بہت چھوٹا سا تھا اور وہاں ڈکوٹا پلین آتا تھا نواب مہدی نواب جنگ اور بیگم مہدی نواز جنگ طاہرہ خالہ نے ایئر پورٹ پر سارے انتظام کروائے۔ نواب اکبر علی خاں نے بھی ایئر پورٹ اتھارٹیز کو ہدایت دی جنرل چودھری نے بھی دل چسپی لی ہماری والدہ کو انہوں نے سمجھایا کہ آپ ڈریے مت سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔ ایئر پورٹ پر اعظم جنگ، مجیب یار جنگ، کمال یار جنگ، علی پاشا، محمد پاشا، سالار جنگ کا خاندان، فخر الملک کا خاندان، خانخاناں کا خاندان مہاراجہ کشن پرشاد، بیگم ولی الدولہ اور نواب ولی الدولہ، نواب حبیب یار جنگ بہادر، نواب خسرو صاحب کے علاوہ والدہ اور نانا سے واقف اکثر لوگ ایئر پورٹ آ گئے

۔ایئرپورٹ پر عجیب سماں تھا۔ نانا صاحب دور کھڑے اپنی بیٹی کی جدائی پر آنسو چھپا رہے تھے نواب حبیب جنگ، نواب خسرو جنگ، ایئر کرافٹ میں اندر تھے نواب خسرو جنگ ہماری سب سے چھوٹی بہن بیگم سلطانہ جو نو مہینے کی تھی اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ والدہ کے سیٹ پر بیٹھنے کے بعد سلطانہ کو ان کی گود میں دے دیا نواب رئیس جنگ بھی ڈکوٹا میں تھے ہم بچوں کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا ہو رہا۔ بس اتنا اندازہ تھا کہ کچھ غیر معمولی ہو رہا ہے۔ ڈکوٹا کے دروازے بند ہوئے۔ کھڑکیوں سے دیکھا تو سب ہم سے دور ہو رہے ہیں پنکھے کے آواز بڑھتی گئی۔ محبت بھری صورتیں اور ان کے آنسو ہماری آنکھوں میں بھی تیرنے لگے ہوائی جہاز جا گیردار کالج، حسین ساگر سے گزرا تو حسین ساگر اور اطراف کے کھیتوں میں سفید سفید

چھوٹے چھوٹے نقطے نظر آنے لگے یہ بگلے تھے۔ بیگم پیٹ اسٹیشن کی ریل گاڑی ممبئی کے لیے گزر رہی تھی۔ نواب فخر الملک کا سنگ مرمر میں بنا شاندار مقبرہ اکیلا کھڑا دکھائی دیا۔ ایک منٹ بعد ارم نما درختوں میں چھپا ہوا اور اس کی اونچی کمان دکھائی دی پھر دور سے ارم منزل نوبت پہاڑ فتح میدان اسمبلی ہال، پبلک گارڈن اور پھر ہمارا ''چار مینار'' نظروں سے اوجھل ہونے لگا ہمارے شہر، ہمارے شہر کی محبت کرنے والی شخصیتیں ہماری شاندار تہذیبی اور تاریخی عمارتیں ہم سے دور ہوتی گئیں جیسے جیسے یہ دریاں بڑھتی گئیں ویسے ویسے دل میں ان کی یادیں گھر کرتی گئیں وہ سنہرے دن بھی دیکھے تھے ہمارے بچپن نے جوانی نے اور آج جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس کے بارے میں کیا کہیں کہاں گیا ہمارا حیدرآباد۔

سعیدہ بانو احمد

ڈگر سے ہٹ کر

اب یہ ہونے لگا کہ ہر جمعہ کو اختری بائی عورتوں کے پروگرام کے بعد مجھ سے ملنے اسٹوڈیو پہنچ جاتیں۔ میں پہلے ہی دل ہی دل میں انہیں اونچا مقام دے چکی تھی۔ ملنے آ جاتیں تو بہت خوشی ہوتی۔ دھیرے دھیرے انہوں نے اپنی زندگی کے حالات سنانا شروع کیے۔ طوائف کے پیشے سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ''ابتدا میں میری ماں نے مجھے ایک رئیس کے یہاں رکھوا دیا تھا۔ میری عمر کم تھی اور میں بغاوت نہ کر سکی۔ وہاں سے بڑی مشکل سے جان چھوٹی، اب نواب صاحب رام پور کے دربار میں ہوں مگر دل بے چین رہتا ہے کہ کس طرح یہاں سے بھاگ نکلوں، اشتیاق میاں پر جان جاتی ہے۔ آپ ہی اب کچھ میری مدد کریں''۔

میں ان کی کہی ہوئی سب باتوں کو گھول کر پی گئی اور ذہن میں یہ نقشہ جم گیا کہ حالات کی ماری ہوئی ہیں۔ اپنے ماحول سے سخت بیزار ہیں۔ شریفانہ زندگی گزارنا چاہتی ہیں اور مجھے ان کی ضرور مدد کرنا چاہیے۔ میں نے اپنی ساس اور والدہ سے اختری کی شرافت کی دھاک باندھ دی۔ دونوں نہایت روایتی ماحول کی پروردہ خواتین۔ ایک طوائف کا حال اور اس کی زندگی کی پیچیدگی سن سن کر حیران ہوئی تھیں۔ ایک دن میں نے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ اختری سے ملئے۔

''اے نہیں دولہن پتریوں سے پردہ ہے نا؟'' میری ساس نے کہا۔

''تو وہ پتریا تو نہیں ہے۔ چچی جان برے ماحول میں رہ کر بھی اتنی پاکباز عورت ہے۔ آپ لوگ ملیں گے تو اس میں شریفانہ جذبات اور ابھریں گے.....'' اماں خاموش رہتیں۔

چند دنوں بعد میں نے پھر ذکر کیا کہ ''اختری کو بلالوں۔ آپ سے ملنے کے لیئے''۔ دونوں بیگمات نے جواب ہی نہیں دیا۔ کچھ دوسری باتیں کرنے لگیں۔

اس درمیان ایک دن اختری نے مجھ سے کہا کہ ''آپ اور عباس رضا میاں میرے یہاں رات کے کھانے پر آیئے۔'' میں نے کہا کہ میں رضا صاحب سے پوچھ کر جواب دوں گی۔ میں نے ابن سے ذکر کیا۔ وہ سوچ میں بیٹھ گئے۔ طوائف کے کوٹھے پر جائیں اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جائیں۔ نہایت ان ہونی بدنامی کی بات، ابن خود کبھی تنہا کسی طوائف کے یہاں نہیں گئے تھے۔ اب تک بے حد پارسا زندگی گزاری تھی لیکن ادب لطیف، شعرو شاعری، موسیقی، قوالی، ان سب چیزوں کا بہت شوق تھا۔ جب موقع ملتا ایسی محفلوں میں شریک ہوتے۔ میں اختری کی سب باتیں ان کو بتاتی رہتی تھی۔ یہ نہایت سیدھے سادے انسان تھے۔ ساری صورت حال کو میں نے ایسا شرافت کا جامہ پہنا رکھا تھا کہ میری ساس اور میری والدہ بھی اختری سے ملنے کے لیے نیم راضی ہو گئیں۔ ابن کو بھی اختری کا ذکر اچھا معلوم ہونے لگا تھا۔ اکثر پوچھ بھی لیتے تھے ان کے بارے میں۔ چنانچہ جب میں نے کہا کہ وہ دعوت میں بلا رہی ہیں تو سوچ میں تو پڑے لیکن پھر راضی ہو گئے چلنے کے لیے۔ اور ایک دن ہم دونوں پہنچ گئے اختری کے کوٹھے پر۔ فرش فروش سے آراستہ کمرہ ایرانی قالین پر گاؤ تکیے لگے ہوئے۔ اختری نے اٹھ کر ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ ان کی والدہ بھی موجود تھیں۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد دسترخوان بچھا۔ کھانا لگایا گیا جو

نہایت پرتکلف اور مزیدار تھا، باتیں اختری بہت دلچسپ کر رہی تھیں لیکن باادب ماملاحظہ قسم کی۔ میرے شوہر پر نہ جانے کیا گزر رہی ہوگی۔ پہلے پہل ایک طوائف سے باتیں کر رہے تھے۔ شعرو شاعری سے واقف تھے ہی۔ موسیقی سے بھی شغف رکھتے تھے۔ دونوں میں خوب باتیں ہوتی رہیں۔ ٹھمری کے بول بھی گنگنائے گئے ہلکے ہلکے۔ پھر اختری نے کہا کہ ''رضا میاں کیا آپ کو ہمارا گانا نہیں پسند ہے۔'' ''نہیں بھئی مجھے تو بہت پسند ہے آپ کا گانا۔'' رضا میاں چونک کر بولے۔

''تو آپ حکم دیں میں کسی دن شام کو آپ کے یہاں آکر گاؤں''۔

ابن نے کہا ''بسروچشم۔ میں آپ کو اطلاع کر دوں گا کہ کس شام کو آپ تکلیف کریں ہمارے یہاں آنے کی''۔ لکھنو آئے تو ہم نے اختری کو دعوت دی کہ وہ آئیں ہمارے یہاں اور اپنی موسیقی کا جادو جگائیں۔ خاندان کے سب لوگ شریک محفل ہوئے۔ دوستوں میں سے ہم نے اشتیاق بھائی کو بھی مدعو کیا وہ بھی تھے۔ اختری کی آواز میں اس رات جو کیفیت تھی اس میں اشتیاق بھائی کی موجودگی بھی شامل تھی۔ محبوب نظر کے سامنے تھا۔ ان کی آواز جادو جگا رہی تھی۔ ساری محفل پر ایک مدہوشی کا عالم طاری تھا۔ صبح ہونے لگی بھیرویں کی تان ختم ہوئی۔ سب چونک چونک کر تعریفوں کے پل باندھنے لگے۔ اختری جھک جھک کر آداب بجالا رہی تھیں ہم لوگوں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ دوسو روپے کا نذرانہ پیش کیا اور خدا حافظ کہہ کر اختری بائی کو رخصت کیا۔ پھر دیر تک سحر زدہ سے بیٹھے ان کی باتیں کرتے رہے۔

اسد دو سال سے میری بہن کے پاس تھا اور St. Marry نرسری اسکول میں داخل تھا۔ حکیم شفاء الملک عبدالمعید کی دوا پورا گلاس بھر کر انہیں صبح شام دی جاتی تھی اور Appendictis کا درد نہیں ہوا تھا۔ میں نے سوچا اب دوا بند کر کے دیکھوں شاید مرض جا تا رہا ہے۔

دوا بند کرنا تھا کہ ایک دو مہینے بعد اسد کے پھر درد ہوا۔ ڈاکٹر کے حکم کے مطابق اس کو بے حس وحرکت لیٹنے کو کہا گیا اور اسد غریب کو پندرہ دن تک وہی مصیبت اٹھانا پڑی جو وہ پہلے بھگت چکا تھا۔ کھانا پینا بند اور درد کی شدت ایسی کہ بچہ خود منع کرتا تھا کہ اسے کروٹ بھی نہ دلائی جائے۔ اب ابن اور میں دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ آپریشن کروا ہی دیا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپریشن کے نام سے دل ہولتا تھا۔ اسد کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی۔ ہم لوگوں نے ہمت کر کے لکھنو کے بلرام پور ہسپتال میں اسد کو داخل کیا۔ کرنل کلائیڈ سرجن تھے، دوسرے دن انہوں نے آپریشن کیا۔ سارا خاندان ہسپتال میں جمع تھا اور نرس دس دس منٹ کے بعد آپریشن روم سے نکل کر مجھے تسلیاں دے رہی تھیں کہ آپریشن اچھی طرح ہو رہا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب یاد نہیں کہ آپریشن میں کتنی دیر لگی اس وقت تو معلوم ہو رہا تھا کہ گھنٹوں لگ گئے۔ آپریشن کے بعد اس کو ڈاکٹر نے چھ دن ہسپتال میں رکھا۔ آپریشن خدا کے فضل سے کامیاب رہا اور کچھ عرصے بعد اسد مکمل طور پر شفایاب ہو کر نارمل بچوں کی طرح کھیل کود اور تعلیم میں مصروف ہو گئے۔

ایک دن میں لکھنو میں والا قدر روڈ سے گزر رہی تھی بالکل غیر ارادی طور پر میں نے موٹر اختری کے گھر کی طرف موڑ دی وہ والا قدر روڈ پر ہی رہتی تھیں۔ گاڑی ان کے گھر کے سامنے روک کر میں نے ہارن بجایا۔ دو تین منٹ کے بعد ایک عجیب سے حلیہ کا آدمی نکلا۔ میں نے کہا کہ میں بیگم صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ اور پھر بغیر کچھ کہے غائب ہو گیا۔ میں نے چند منٹ انتظار کیا۔ دروازے کے پیچھے کچھ گڑ بڑ سی

محسوس ہوئی۔ دروازہ کھلا اور اشتیاق بھائی یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ ''آو بٹن آو ادھر کیسے آ گئیں۔'' میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا اشتیاق بھائی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ وہاں اختری مسکراتی، قریب قریب مجھے گلے لگاتی ہوئی کہہ رہی تھیں کہ ''اللہ آپ نے کیسی اچھی بات کی کہ میرے غریب خانے پر آ گئیں۔ ابن میاں کہاں ہیں بی بی آپ چائے پئیں گی اللہ آپ بیٹھ تو جایئے۔ اب تو آپ کھانا کھا کر جائیں گی۔'' غرض کہ اخلاق اور التفات کی بوچھار کیے دے رہی تھیں۔ میں بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے بہ مشکل تمام سمجھا سکی کہ کھانا تو گھر پر کھانا ہے مجھے جانے دیجئے وغیرہ وغیرہ۔ اب بتدریج اور بہت سی باتیں معلوم ہونا شروع ہوئیں۔ اشتیاق بھائی اختری سے ملتے رہتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو کئی برسوں سے جانتے تھے۔ لیک ان اس شناسائی میں محبت کی جڑیں پھوٹ آئی تھیں اور دونوں بے حد پریشان تھے کہ کیا کریں اشتیاق بھائی ایک طوائف سے شادی کیسے کریں۔ سارے خاندان کی رسوائی ہوگی۔ پرانے رسم و رواج کی مضبوط دیوار میں وراڑ ڈالنا اب سے 50 سال پہلے ایسا آسان نہیں تھا جیسا آج ہے۔ ہزاروں سال پرانی دیواریں گرتی ہیں پھر سے نئی دیواریں بنتی ہیں۔ اس بوڑھی دنیا کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے۔

اب اختری اور اشتیاق غالباً روز ہی مل رہے تھے اور آتش عشق کی تاب لانا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ میں بارہ بنکی سے آئی تو اشتیاق بھائی مجھ سے ملنے آئے اور بہت رک رک کر اس کا اظہار کی کہ وہ اختری سے نکاح کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں ابن اس وقت لکھنو میں ہوں۔ میں خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ ختم ہفتہ میں ہم دووں لکھنو میں ہوں گے۔ اشتیاق بھائی نے ایک Flat بہ طور آفس کے قیصر باغ میں لے رکھا تھا۔ ہم دونوں وہاں لائے گئے۔ ایک مولوی صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے اور اشتیاق بھائی کا خاص خادم گلاب بھی تھا۔ میں اپنے ساتھ اپنا نکاح کا دوپٹہ لیتی گئی تھی۔ وہ میں نے اختری کو اوڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ مہر غالباً 25 ہزار مقرر ہوا۔ ابن اور گلاب نے بطور گواہ نکاح نامے پر دستخط کیے۔ مبارک سلامت کے ساتھ ہم سب نے ولیمہ کا کھانا کھایا اور پھر دونوں میاں بیوی کو چھوڑ کر گھر آ گئے۔ اختری بائی سے بیگم اختر ہو گئیں۔ یہ قصہ ہے 1943ء کا، میں نے اختری کے اعزاز میں ایک پردہ پارٹی کر کے انہیں لکھنو کی بیگمات اور رانی مہارانیوں سے متعارف بھی کروا دیا۔ اب گویا ان کے لیے وہاں کی سوسائٹی کے دروازے کھل گئے۔ ابن اور اب قدرے آزادی سے ان کے یہاں آنے جانے لگے۔ میرا گھر کا شانہ رضا اور میری بہن کا گھر کپورتھلا ہاؤس کے احاطے کی دیواریں ملی ہوئی تھیں اور ہم دونوں کے بچے آسانی سے ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے رہتے۔ بڑوں کے لیے بھی یہ آسانی تھی۔ میں ایک دن اپنے بہنوئی علی ظہیر صاحب کے یہاں ان کے گول کمرے (ڈرائنگ روم ان دنوں گول کمرہ کہلاتا تھا) میں بیٹھی ہوئی ان کی بیٹی کمن سے باتیں کر رہی تھی کہ بیرا نے ایک تار لا کر دیا۔ کمن اسے پڑھ ہی رہی تھی کہ علم بھیا (علی ظہیر صاحب) آ گئے۔ ''پوچھا کس کا تار ہے۔ جمیلہ کا ہے'' کمن نے کہا۔

کیا لکھتی ہیں جمیلہ بیگم۔ علی ظہیر بولے

''اپنے شوہر برج بھوشن کے ساتھ کل آ رہی ہیں۔ ہمارے یہاں ٹھہرنے کو'' کمن نے بتایا۔

''ایسے لوگوں کا بائیکاٹ کرنا چاہیے وہ ہمارے یہاں نہیں ٹھہریں گی۔'' علن بھیا نے مشورہ دیا۔

قدرے وقفے کے بعد علن بھیا بولے ''Boycott تو ہمیں سعیدہ کا بھی کرنا چاہیے یہ اختری سے ملتی ہیں۔'' میں نے کہا کہ آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں۔

بائیکاٹ اب سے سہی۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ کا کوئی جگر گوشہ ایسی بات کرتا تو کیا آپ اپنے اصولوں پر قایم رہتے''۔

''کمن جمیلہ برج بھوشن کو میرے یہاں ٹھہرا دنیا''۔ یہ کہتے ہوئے میں اپنے گھر آ گئی۔

مجھے علن بھیا بھی کا کہنا بہت ناگوار گزرا تھا۔ کہاں تو وہ سب اس قدر روشن خیال بنتے ہیں اور کہاں ایسی تنگ نظری۔ معلوم نہیں میرے چلے جانے کے بعد وہاں کیا باتیں ہوئیں۔ دوسرے دن علن بھیا مجھے منانے کا شانے رضا آئے۔ یہاں جمیلہ برج بھوشن بیٹھے ہوئے تھے۔ علن بھیا الٹے پیروں واپس چلے گئے اور پھر تین مہینوں تک نہ میں ان کے گھر گئی نہ وہ آئے۔ خاندان کے باقی سب لوگ میری بہن ان کے بچے۔ میرے بچے میرے شوہر معمول کے مطابق ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے رہے۔

جمیلہ کمن کی بچپن کی دوست تھیں۔ جمیلہ کی والدہ جنت بیگم میری بہن کی دوست تھیں۔ مردوں میں بھی خاندانی مراسم تھے۔ جمیلہ نے اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر دوسری شادی اپنے ہم جماعت کائستھ طالب علم سے کی تھی پہلے ہندو مسلم شادیاں بہت معیوب سمجھی جاتی تھیں اور شاذ و نادر ہی ایسی شادیاں ہوتی تھیں۔

جنت بیگم بڑی شخصیت کی خاتون تھیں۔ ان کے بارے میں ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

آفت ناگہانی

1942ء کی بات ہے ختم ہفتہ کے بعد ہم لوگ واپس بارہ بنکی جا رہے تھے۔ بچے اور آیا پیچھے کی سیٹ پر تھے ابن موٹر چلا رہے تھے کہ یکا یک ایک بڑا سا کیڑا چلتی گاڑی میں عباس رضا کی آنکھ سے ٹکرایا اور غائب ہو گیا۔ ابن نے فوراً موٹر روکی۔ آنکھ میں سخت چوٹ آئی تھی۔ میں نے ان کے رومال سے آنکھ پر پٹی باندھی۔ اور پھر خود موٹر چلا کر بارہ بنکی پہنچی۔ یہاں آنکھ کو بورک لوشن سے دھویا، سینکائی کی لیکن تکلیف میں کمی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن میں ان کو لے کر لکھنو آئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا انہوں نے کہا کہ کیڑے کا ڈنک Cornea آنکھ کا ڈھیا پار کر کے نیچے تک اتر گیا ہے اس لیے زخم بھرنے میں دیر لگے گی۔ اب علاج شروع ہوا درد میں کمی تو ہو گئی لیکن آنکھ کی بینائی میں فرق محسوس ہونے لگا۔ آنکھ کی معمولی سی چوٹ مستقل روگ بن گئی۔ درد تو جاتا رہا لیکن علاج ضروری تھا، ہم لوگوں ے بہت کوششیں کر کے ابن کا تبادلہ لکھنو کروا لیا، یہ کچہری جانے لگے خود موٹر نہیں چلاتے تھے۔ میں پہنچاتی تھی اور پھر واپس لینے آتی تھی۔

اب معمول یہ ہو گیا کہ پہلے بچوں کو اسکول لے جاتی پھر ابن کو کچہری پہنچاتی پھر دوپہر میں اسکول سے بچوں کو گھر لاتی کھانا وغیرہ کھلا کر انہیں دو گھنٹے کے لیے آیا کے سپرد کرتی کہ بس کمرے میں کھیلیں سوئیں یا کتاب پڑھیں۔ خود کچھ دیر آرام کر کے ان کو کچہری لینے چلی جاتی۔ یہ پہلے ہی تنک مزاج تھے اب کچھ اور زیادہ ہو گئے حالاں کہ اب میں ان کے آرام اور ان کے مزاج کے اتار چڑھاؤ کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھی مگر جو انسان پہلے ہی اس قدر دل برداشتہ رہنے لگا ہو کہ آئے دن کسی نہ کسی بات کو اس درجہ محسوس کرتے کہ اپنا جینا دوبھر کر لیتے تھے۔ ان میں اتنا تحمل کہاں تھا کہ وہ ایک مستقل جسمانی تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کر سکتے۔ میں اکثر بیٹھ کر باتیں کرتی کہ''آپ کے دو بڑے پیارے بچے ہیں کچھ ہمت سے کام لیجئے انشاءاللہ آنکھ کی تکلیف دور ہو جائے گی۔ اس قدر اداس رہتے ہیں یہ کیسی ناشکری کی بات ہے۔ میں ایسی بری بیوی بھی نہیں ہوں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو تو بتا دیا کیجئے۔''

میں بڑی خوش فہمی سے یہ گفتگو شروع کرتی لیکن اکثر بات چیت کا یہ سلسلہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتا۔ مجھ پر ایسے ایسے الزام لگائے جن کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ مجھے جس قدر دکھ پہنچا

سکتے تھے پہنچاتے، آنکھ کے حادثے سے پہلے بھی یہی کیا کرتے تھے۔ تب میں بھی برس پڑتی تھی۔ اور ہمارے درمیان بڑا بھیانک خلا پیدا ہو جاتا تھا۔ لیکن اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان پر ایک جنون طاری ہوتا ہے اور اس وقت ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زبان کا گھاؤ کبھی نہیں بھرتا ہے۔ ان کی آنکھ میں چوٹ آنے سے پہلے سے ہمارے درمیان دوری بڑھتی جا رہی تھی اور میں نے ان سے کہا تھا کہ خدارا ایسا نہ ہونے دیجئے۔

جب سے آنکھ میں چوٹ آئی تو میں نے اپنے زخموں پر خود ہی پھاہا رکھا اور سارے گلے شکوے پس پشت ڈال کر دل و جان سے ان کی خدمت میں لگ گئی۔ سر میں درد بتاتے تو سرہانے بیٹھ جاتی، پیٹ میں درد ہو رہا ہے تو جلدی جلدی گرم پانی کی بوتل رکھتی، گھٹنوں پیر دباتی رہتی۔ یہ خود کو نازک سے نازک تر بنائے دے رہے تھے۔ میں ہزار ہمت بڑھانے کی باتیں کرتی اثر کچھ بھی نہ ہوتا۔ اثر تو جب ہوتا جب یہ دل سے طے کر لیتے کہ سخت آزمائش ضرور ہے لیکن حوصلہ تو قایم رکھنا ہے۔ مجھے یہ امید بھی بندھی کہ مصیبت میں انسان کی طبیعت میں لوچ نرمی اور مفاہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، ابن میں یہ تبدیلی آ جائے اور یہ شبہ اور نفرت کو اپنے دل سے نکال پھینکیں مگر کچھ بھی نہ ہوا۔

1944ء میں لکھنو کے ڈاکٹروں نے یہ مشورہ دیا کہ ممبئی میں ماہر امراض چشم ڈاکٹر سرڈ گن ہیں ان کے پاس بغرض علاج جانا چاہیے۔ میں نے فوراً سرڈ گن کو لکھا ان سے وقت اور دن مقرر ہو گیا اور اکتوبر میں ہم ممبئی روانہ ہو گئے۔ ایک ہوشیار اور مستعد چپراسی ہمارے ساتھ تھا اور ہم لوگ ابن کے پھوپھی زاد بھائی محسن کے یہاں ٹھہرے۔ محسن کا گھر دادر میں تھا، اپنے بچوں کو میں ان کی دادی نانی اور خالہ کی نگرانی میں چھوڑ کر آئی تھی اور یہ پہلی مرتبہ تھا کہ میں اپنے بچوں سے الگ ہوئی تھی۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر ہم لوگ سرڈ گن کے Clinic پہنچ گئے۔ انہوں نے ابن کی آنکھ کا معائنہ کیا اور تشخیص یہ کی کہ ابن کی آنکھ میں Corroditis ہے۔ یہ مرض جسم میں کہیں کوئی Infection موجود ہونے سے ابھر آتا ہے۔ یہ Infection دانتوں میں بھی ہو سکتا ہے یا Tonsils میں۔ اس کی تفتیش کی جائے اور مکمل علاج ہو تو Infection دور ہو جائے گا ورنہ یہ مرض اور بڑھے گا سرڈ گن نے مشورہ دیا کہ کان ناک اور حلق کے امراض کے ماہر گاندھی نامی ڈاکٹر ہیں۔ ان سے Tonsil کا آپریشن کروایا جائے سرڈ گن کے Clinic سے نکل کر میں نے ابن سے کہا کہ اب تشخیص تو ہو گئی ہے لکھنو میں ایک سے ایک اچھا ڈاکٹر موجود ہے چلئے واپس وہاں اپنا گھر ہے ہر طرح کی سہولت رہے گی یہاں آپریشن میں بڑی زحمتوں کا سامنا ہوگا۔ لیکن ابن نہیں مانے وہ بضد رہے کہ یہیں ممبئی میں ہی آپریشن کروایا جائے۔ مجھے طرح طرح کے وسوسے پریشان کیے ہوئے تھے۔ ابن کو Colic کا درد دوبارا اٹھ چکا تھا۔ جس میں درد کے ساتھ متلی بھی ہوتی تھی۔ اب اگر Tonsils کے آپریشن کے بعد پیٹ کے درد کا دورہ پڑ گیا تو میں کیا کروں گی۔ Tonsils کے آپریشن کے بعد اگر حلق سے خون جاری ہو جائے گا تو اس کا روکنا مشکل ہو جاتا ہے اور بہت خطرناک صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر لکھنو میں میرا ساتھ دینے والے رشتہ دار موجود ہیں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے یہ سب ہی کچھ کہا۔ لیکن ابن نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ میں کمر بستہ قسم کی عورت ہوں، سوچا کہ چلو یونہی سہی ہم لوگ ڈاکٹر گاندھی کے پاس پہنچے۔ بہت Matter of Fact قسم کے معلوم ہوئے۔ زیادہ بات چیت تو کی نہیں، بس آپریشن کی تاریخ مقرر کی اپنی فیس بتائی۔ کچھ اور ضروری باتیں کیں، اس کے بعد خاموش ہو گئے ملاقات ختم۔ ابن کو یہ ڈاکٹر گاندھی کا خشک اندا بالکل اچھا معلوم نہیں ہوا۔ بولے کہ ''کوئی اور ڈاکٹر تلاش کریں''۔ ڈاکٹر گاندھی سے تو میں آپریشن

نہیں کرواؤں گا میں نے بحث نہیں کی، مریض کی مرضی کا ڈاکٹر بہت ضروری ہوتا ہے جس پر مریض کا اعتماد ہو۔ اب یہ مشکل کہ سرڈ گن ہی ہمارے معاون اور مشیر ہیں۔ ان کے تجویز کیے ہوئے ڈاکٹر کو کیسے رد کر دیں۔

ابن کے چچازاد بھائی محسن سے مشورہ کیا کچھ اور پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ ایک اور ڈاکٹر RAF Cooper ہیں جو ڈاکٹر گاندھی کے ٹکر کے ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہیں ہم ان سے جا کر ملے۔ ڈاکٹر گاندھی کے بالکل برعکس تھے، جاذب نظر شخصیت، مجسم اخلاق، نفیس اردو بولتے ہوئے ڈاکٹر Cooper نے ہمارا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ''تشریف رکھیے نواب صاحب میں کیا خدمت کر سکتا ہوں''۔ مجھے کہنا پڑا کہ ''ڈاکٹر صاحب ہم لوگ نواب نہیں ہیں۔ معمولی لوگ ہیں آپ کی شہرت سن کر آئے ہیں۔ آپ کے پاس''۔

ڈاکٹر Cooper نے مسکرا کر معافی مانگی کچھ لکھنو کی تہذیب کا ذکر کیا اور پھر دریافت کیا کہ ''رضا صاحب آپ کو کیا شکایت ہے۔'' انہوں نے سارا حال بتایا۔ ڈاکٹر Cooper نے St. Elizabeth نرسنگ ہوم کو ٹیلی فون کر کے سارے مرحلے طے کر دیئے۔ آپریشن کی تاریخ، نرس، آپریشن تھیٹر وغیرہ سارا انتظام ٹیلی فون پر ہو گیا۔

مقررہ تاریخ پر ہم دونوں St. Elizabeth نرسنگ ہوم پہنچ گئے۔ کمرہ دیکھا نرس موجود تھی۔ سب کچھ بہت ہی درست۔ بے حد صفائی اور Staff میں بہت ہی تمیز و تہذیب دوسرے دن دس بجے صبح مریض کو آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ میں قدرے فاصلے پر ایک کمرے میں بٹھا دی گئی کوئی 45 منٹ بعد ڈاکٹر Cooper آئے اور مجھے ہر طرح کا اطمینان دلایا کہ آپریشن کامیاب رہا ہے اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ نرس نے جس کو ہم نے ایک دن پہلے ہی رکھ لیا تھا، مریض کے پاس برابر موجود رہی۔ شام ہوتے ہوتے مریض کو کمرے میں لایا گیا انہیں ہوش آ گیا تھا لیکن بات کرنے کو منع کیا گیا تھا۔ نرس تیمارداری کے اپنے فرائض پورے کر رہی تھی۔ وہ تھی بہت مستعد اپنے کام میں ہوشیار اور ہنس مکھ عورت تھی۔ رات ہو گئی مریض کو تو شاید کوئی دوا دے دی گئی کہ وہ آرام سے سوئے۔ نرس اپنی کرسی ٹھیک کر کے مریض کے پاس بیٹھ گئی۔ میرے لیے برامدے میں پلنگ تھا میں بھی لیٹ گئی اور شاید سو بھی گئی۔ اب رات کے کوئی دو بجے تھے۔ جب نرس نے مجھے جگایا اور کہا کہ مریض کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے میں نے گرم پانی کی بوتل لگا دی ہے۔ لیکن ڈاکٹر کو فوراً بلا یئے۔ یا خدا۔ میں خاموشی سے اٹھی اور نیچے گئے جہاں ٹیلی فون تھا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ لکھ سکوں کہ اندر سے میرا کیا حال ہو رہا تھا۔ جس بات کا خدشہ تھا وہی ہوئی۔ خدا مالک ہے نیچے آئی تو معلوم ہوا کہ ٹیلی فون خراب ہے میرے حواس اور گم ہوئے۔ میں نے چوکیدار سے پوچھا کہ کوئی پاس میں گھر ہے جہاں میں ٹیلی فون کر سکوں۔ اس نے قدرے تامل سے کہا کہ سامنے کے بنگلے میں پوچھئے۔ میں نے سڑک پار کی تو ایک بڑا سا پھاٹک نظر آیا۔ دور کوٹھی کے برآمدے میں ایک لالٹین ٹمٹماتی دکھائی دی۔ میرے دستک دینے پر چوکیدار لالٹین لیے ہوئے پھاٹک پر آ گیا۔ مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا، بولا ''کون ہو تم کیا کام ہے؟؟ میں نے روداد بیان کی کہ ''ہسپتال میں میرے شوہر بیمار ہیں۔ ہمیں ڈاکٹر کی فوراً ضرورت ہے اور ہسپتال کا ٹیلی فون خراب ہے''۔

چوکیدار نے بادل ناخواستہ پھاٹک کھولا۔ مجھے برآمدے میں لایا جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شروڈ کر کو ٹیلی فون کیا وہ بیس پچیس منٹ میں ہسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر شروڈ کر کو پہلے سے ہی ہم لوگوں نے مقرر کر لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ فوراً آ جائیں گے۔ کوئی پونے تین بجے وہ مریض کے پاس تھے انہوں

نے درد پر قابو پانے کا انجکشن دیا جس سے مریض کی تکلیف فوراً کم ہونا شروع ہوئی۔ ڈاکٹر شروڈ کر جو بھی انجکشن دے گئے تھے اس کے بعد درد دب گیا اور مریض کو نیند آ گئی۔ صبح ڈاکٹر Cooper آئے انہوں نے بھی اطمینان دلایا کہ Colic کا علاج بھی ہو رہا ہ اور آپریشن بھی درست ہوا ہے۔ آپ تین دن بعد رضا صاحب کو گھر لے جاسکتی ہیں۔

جس گھر سے میں نے ڈاکٹر شروڈ کر کو ٹیلی فون کیا تھا وہاں سے چلتے چلتے میں نے چوکیدار سے پوچھا تھا کہ یہ کس کا گھر ہے اس نے جواب دیا تھا۔ ''سرڈ گن کا''۔

یا خدا کیا امداد غیبی ہے۔ ہسپتال میں بے یار و مددگار تھی اور اب وہ مربی مل گیا جس کا نام سن کر ہم لکھنو سے ممبئی آئے تھے۔

دوسرے دن میں سرڈ گن سے ملنے گئی۔ سارا ماجرا سنایا اور معذرت چاہی کہ ہم نے ان کی تجویز سے ہٹ کر ڈاکٹر Cooper سے آپریشن کروایا۔ سرڈ بن بڑی شفقت سے پیش آئے۔ ڈاکٹر Cooper کی بھی تعریف کی اور کہا کہ ''تکلف مت کرنا کوئی بھی ضرورت ہو تو میں یہاں موجود ہوں''۔ سرڈ گن بزرگ آدمی تھے اور ہمارے چار مہینے کے ممبئی کے قیام میں ہمارے ساتھ وہ بہت ہمدردی اور مہربانی سے پیش آئے اور ان کی ذات سے ہماری بہت ڈھارس بندھی رہی۔ میں ممبئی کے محلوں سے واقف نہیں تھی اور میرے سراسیمگی کے عالم میں سرڈ گن کا گھر ہسپتال کے سامنے ہونا میرے لیے ایک معجزہ سے کم نہیں تھا۔

سرڈ گن کے پاس ہم ابن کے آپریشن کے بعد گئے اور انہوں نے پھر جتنے علاج ان کے دانتوں کے سلسلے میں تجویز کیے۔ ہم نے وہ سب کر ڈالے اور بالآخر اس امید کے ساتھ کہ مرض کو دور ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا لکھنو واپس آ گئے۔ یہ شروع 1944ء کی بات ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ ان کے مزاج کے اتار چڑھاؤ سے میں نے مصالحت کر لی تھی۔ دکھ ضرور تھا لیکن میں حتی المقدور سب ہی کچھ کر رہی تھی، گھر معمول کے مطابق چل رہا تھا، بچے اسکول جاتے پھر کھیل کود اور ہوم ورک میں لگ جاتے۔ ابن جب جی چاہتا خوش خوش گھر کے معمول میں شرکت کرتے، بچوں سے بھی دلچسپی لیتے اور شام کو ہم لوگ اکثر اختری کے یہاں چلے جاتے۔

غرض کہ زندگی یوں ہی گزر رہی جاتی۔ لیکن وقت کی ناشدنی ایک دن ابن باغ میں مالی کے ساتھ ایک جھاڑی کٹوا رہے تھے۔ جس میں بڑے بڑے کانٹے تھے۔ ابن جھاڑی کی ایک شاخ کو پکڑے ہوئے مالی کو ہدایت کر رہے تھے کہ اس جگہ سے کاٹو، شاخ ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کا بڑا کا نٹا ان کی دوسری آنکھ میں لگا اور Cornea کو پار کر گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلی آنکھ میں چوٹ لگی تھی۔

یا اللہ یہ بلائے ناگہانی ان ہی پر آنی تھی۔ یہ خدا کے نیک بندے جو پہلے سے ہی زندگی کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے، جن میں یہ تک سہار نہیں تھی کہ روزمرہ کو کیسے نبھایا جائے۔ خدایا انہیں اس قدر بھیانک امتحان میں کیوں مبتلا کر دیا۔ مصلحت خداوندی انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔ ابن تو خود اپنے دشمن تھے۔ زمانے کو دشمن ہونے کیا ضرورت تھی۔ اب پھر سے دوسری آنکھ کا علاج شروع ہوا۔ دھیرے دھیرے زخم بھرنے لگا لیکن اس آنکھ کی بینائی پر بھی اثر ہو گیا اور عباس رضا کی قنوطی ذہنیت اور سان پر چڑھ گئی۔

رعائتی نرخ پر

ادیبوں وشاعروں کی کتابوں کے اشتہارات

''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

شاعری

نظم

بی۔ٹا

ترجمہ: فرح تزئین

آدھی رات کو بلندی سے دیکھا ہوا حیدرآباد کا ایک منظر

(حیدرآباد لٹریری فیسٹیول 2019ء کے دوران شہر سے متاثر ہوکر لکھی گئی نظم)

عظیم برطانیہ کے مور کے پھیلے ہوئے پروں کی مانند
طیارے کے پنکھ
رن وے کے باہر لہلہاتی گھاس کو گرم ہوا نے چھوکر
پریشان کردیا
جیسے نشے میں بدمست کوئی رقاصہ
اپنے گھر کے راستے پر بدن پسارے لیٹی ہو
آج کی رات وہ ایک آزاد شہر جیسی ہے
اس کی ساری کے ہزاروں چمک دار ٹکڑے ستاروں کو
رجھا رہے ہیں
اور اس کے دل میں چھپی تلخیاں اور کڑواہٹ کو عیاں
کررہے ہیں
شاداب پھول اس کے مندر سے نکل کر
گردوغبار کے ساتھ اڑ گیا ہے
مدہوشی کی حالت میں
اسے یہ بھی خبر نہیں کہ یاسمین کا پھول
ایک انڈے کی طرح ہوا میں ٹوٹ کر بکھیر گیا ہے
نائٹ کلب سے چوراہے تک کا آخری نغمہ ہونٹوں پر
ادھورا رہ گیا جیسے مصری کا آدھا ٹکڑا
اسے ڈراونے خواب سے بچانے کا
ایک سنہرا راستہ
اس کے جسم کے درمیان
سے وجود میں آیا ہے جو
بظاہر اس گہرے نشے سے اسے باہر نکالے گا
اور پھر خود کہر آلود منزل کی طرف
سرپٹ دوڑنے کی کوشش کرے گا

شاعری

غزلیں

مصحف اقبال توصیفی

کوئی آئینہ رو، آئینہ کوئی
وہی چہرہ ، مرا آنسو تھا کوئی ؟
تو جاگو رات بھر بیٹھے رہو تم
نہیں آیا نہیں آئے گا کوئی
مگر سچ سے زیادہ سچ تو یہ ہے
سناؤں میں بھی اک افسانہ کوئی
مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا تھا
مگر تھا درمیاں پردہ سا کوئی
اگر اوروں سے تھی اتنی محبت
تو میرے ساتھ کیوں رہتا تھا کوئی
یہ دنیا ۔ ہم اسے بہتر بناتے
تمہارے ذہن میں نقشہ تھا کوئی ؟

سمجھ رہے تھے جسے اپنا آشیاں نہ ہوا
وہ میرا گھر نہ سہی وہ مرا مکاں نہ ہوا
قلق رہا کہ یہ دل اپنا کسی کو دے آئے
رہا یہ جاں کا زیاں تو کوئی زیاں نہ ہوا
یہ کیسا عشق ہے حیرت سے خود کو تکتے تھے
زمیں پہ پاؤں نہیں سر پہ آسماں نہ ہوا
بچھڑ کے تجھ سے وہ جیسے بچھڑ گیا خود سے
وہ بے اماں ہوا ایسا کہ بے اماں نہ ہوا
کہا دکھاؤ اگر ہم پہ جان دیتے ہو
یہ امتحان اگر ہے تو امتحاں نہ ہوا
یہ کون ملک ہے یہ کیسے دشت و دریا ہیں
یہ کیا زمین ہوئی جس پہ آسماں نہ ہوا
کھلا جو اُن پہ کہ دشمن تو اپنے ہم ہی ہیں
پھر اس کے بعد کوئی ہم پہ مہرباں نہ ہوا

[redacted]

غزلیں

رؤف خیر

ہاتھ پھیلا نے کی ذلت نہ کبھی دے کوئی
مجھ کو دینا ہی دعا ہے تو یہی دے کوئی

اُس سے پہلے اِسے سینے سے لگالوں بڑھ کر
اُس کے آنے کی اگر خوش خبری دے کوئی

میں تو مہکوں گا ہر اک ہاتھ پہ احساں کی طرح
عطر ہوں چاہے خریدے نہ خریدے کوئی

ہم کسی کا کوئی احسان کہاں رکھتے ہیں
پھول لے جائے وہ ہم سے جو کلی دے کوئی

دیکھ لیتا ہے اسی کو تو وہ جی اُٹھتا ہے
چھوڑ دیتا ہے جسے دیکھ کے دیدے کوئی

اس لیے کرتا ہوں میں ردّ عمل کا اظہار
بے حسی کا کہیں طعنہ نہ کبھی دے کوئی

خیر بے ساختہ چیخیں تو نکل آئیں گی
لاکھ مظلوموں کے ہونٹوں کو بھی سی دے کوئی

ناکام و نامراد تو وہ خود ضرور ہے
اس کی انگوٹھیوں میں زمرد ضرور ہے
موصوف کے کلامِ بلاغت نظام میں
سرقہ اگر نہیں ہے توارد ضرور ہے
اپنا کمال یہ ہے کہ ہم بے کمال ہیں
لیکن بساطِ شعر میں شدبُد ضرور ہے
بے لوث و بے غرض وہ ہمارے ہیں خیر خواہ
یہ ماننے میں ہم کو تردد ضرور ہے
اُن کی ہمارے بارے میں رائے تو ہے خراب
ہم بے حسوں کو اتنی تو سدھ بد ضرور ہے
نیند یں حرام ہو گئیں فرعونِ وقت کی
موسیٰ ہوا کہیں تو تولد ضرور ہے
انصاف کا شکار ہے باحوصلہ ہے جو
بے حوصلہ شکارِ تشدد ضرور ہے
بلقیس کو ملا ہی سلیمان سے دیا
چھوٹا سا اک پرند تو ہد ہد ضرور ہے
ہم سائے اس سے خوش ہیں نہ اہلِ وعیال ہی
وہ خیؔر کار بندِ تہجد ضرور ہے

شاعری

غزلیں

جمال اویسی

کیوں ذہن میں گونجتا ہے سناٹا
کیوں دل سے چپک گیا ہے سناٹا
بستی میں کبوتروں کے پر پھڑ پھڑ
اُڑتا ہوا خون سا ہے سناٹا
ساحل پہ ہوائیں بین کرتی ہیں
اُڑتی ہوئی ریت کا ہے سناٹا
سڑکوں پہ ہے اژدہامِ خاموشی
ہر گھر سے نکل رہا ہے سناٹا
بستی میں مچا کے ایک ہنگامہ
جنگل کی طرف چلا ہے سناٹا
ہم سب کے مزار بن چکے ہیں یاں
ہم سب کو نگل چکا ہے سناٹا
کب آؤ گے اب جو جا رہے ہو تم
مجھ کو نظر آرہا ہے سناٹا
اک گیت بجا ہے وائلن پر، یا
دل میں مرے گونجتا ہے سناٹا

(گجرات کی ہولناکی کے بعد)

جسم سے چھن رہا ہے سناٹا
روح تک آ چکا ہے سناٹا
کان میں گونجتا ہے سناٹا
آنکھ میں ہولتا ہے سناٹا
شہر میں حکمراں ہے خاموش
ہر طرف چیختا ہے سناٹا
ساحلوں پر ہوا ہے آسودہ
پانیوں پر جما ہے سناٹا
جنگلوں میں مہیب ہے منظر
ہر شجر پر تنا ہے سناٹا
چاند بے نور ہو گیا کیسے
آسماں میں اُگا ہے سناٹا
ہے کتابوں کا پھیلتا جنگل
ذہن میں فکر کا ہے سناٹا

(گجرات کی ہولناکی کے بعد)

غزل و نظم

سیفی سرونجی

کہاں سے لاؤں میں دلچسپیاں کہانی میں
کہ میں نے دیکھی ہے غربت بھری جوانی میں

بکھر چکی ہے مری سلطنت مگر پھر بھی
ابھی تلک ہے مرا رعب راجدھانی میں

سنا ہے جب سے سمندر کے پار رہتے ہو
بنا کے چھوڑ دی کاغذ کی ناؤ پانی میں

رکھوں گا پاس ہمیشہ تری امانت کو
دیئے ہیں زخم جو تونے مجھے نشانی میں

بچھڑ کے تم سے یہ تاثیر ہو گئی پیدا
وگر نہ کچھ نہ تھی گہرائی لفظ و معنی میں

ہر ایک شخص کی منزل، ہے آخرت سیفی
سکون کس کو ملا ہے حیات فانی میں

وہ صدیوں سے
ایک پنجرے ہیں
قید تھا
تمام عمر وہ پھڑ پھڑاتا رہا
کبھی چیختا کبھی چنگھاڑتا رہا
کبھی وہ غصے میں
اپنے پاؤں کی زنجیریں
توڑنے کی کوشش کرتا
لیکن
مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا
ایک دن کسی رحم دل
انسان نے اسے آزاد کر دیا
اور پھر آزاد ہوتے ہی
اس نے ظلم وستم کے
وہ پہاڑ توڑے
کہ پوری، انسانیت چیخ اٹھی

شاعری

نظمیں

اکرم نقاش

لمس

وہ لمس تھا
کہ تھی روشن ہر ایک راہ گزار
وہ لمس تھا
کہ ہوا مخملی فضا ریشم
وہ لمس تھا
کہ تھا اک دستِ شبنمی دل پر
وہ لمس تھا
کہ نشہ بانٹ رہا تھا موسم
وہ لمس تھا
کہ لہو آگ میں بدل جائے
وہ لمس تھا
کہ بدن بجلیوں کی زد پر تھا
وہ لمس تھا
کہ وجود آگ بھی تھا شبنم بھی
وہ لمس تھا
کہ تھی ہر شئے ہوا کے شانوں پر
وہ لمس تھا
کہ کوئی روح میں اُتر تا تھا
وہ لمس تھا
کہ بھری کائنات تھی مجھ میں۔!!!

وقت

زندگی کا سورج پھر
وقت کا الاؤ لئے
سر پہ تن گیا جیسے
اور جم گیا جیسے
....
دن مگر سفر میں ہے
وقت کے سمندر میں
غوطہ زن ازل سے ہوں
اور گوہرِ نایاب
دسترس سے باہر ہے
سچ کہوں تو عنقا ہے
راہِ بے سایہ ہے تا حدِ نظر
سایۂ دیوار نہ کوئی شجر
ہمرہی میں ہے ہر دم
بس اک آبلہ پائی
خارزارِ وقت ہے
اور
بے کراں اندھا سفر
اور سفر مقدر ہے
بے ثمر
بے برگ و بار اشجار کی
نگہبانی باغبانی وقت ہے
وقت ہی مقدر ہے۔!!!

شاعری

غزلیں

شاہد اختر

آشنائے وقار ہوتی ہیں
وحشتیں یوں تو خوار ہوتی ہیں
ہم پر جب آشکار ہوتی ہیں
ساعتیں خوشگوار ہوتی ہیں
اس کی باتیں نزاکتیں اس کی
کسی قدر پُر بہار ہوتی ہیں
ایسی باتوں کا فائدہ کیا ہے
ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں
رنگ دنیا بدلتا رہتا ہے
عظمتیں سب غبار ہوتی ہیں
اس کو پانے کی دل میں رکھنے کی
خواہشیں بے شمار ہوتی ہیں
ان دنوں سب مری تمنائیں
ضعف سے زیر بار ہوتی ہیں
ہر طرف ان کا بول بالا ہے
جن کی باتیں گنوار ہوتی ہیں
چند سکّوں کے واسطے اختؔر
عزتیں تار تار ہوتی ہیں

جن کے سر پہ کوئی دستار گماں ہوتی ہے
ان کی ہر بات سماعت پہ گراں ہوتی ہے
عرصۂ دہر میں کب ہم پہ عیاں ہوتی ہے
زندگی موج میں اپنی ہی رواں ہوتی ہے
اور کچھ بھی نہیں ہوتا ہے یہاں اس کے سوا
جس طرف دیکھتا ہوں آہ و فغاں ہوتی ہے
در و دیوار بھی کہتے ہیں کہانی اپنی
در و دیوار کی بھی اپنی زباں ہوتی ہے
تیرے انداز ملاقات پہ مٹنے والی
بوڑھی ہوتی ہوئی تہذیب جواں ہوتی ہے
دیدنی وہ شب امکان کہاں سے لاؤں
خیر اب اس کی ضرورت بھی کہاں ہوتی ہے
کوئی حد تو یہاں قایم ہو یقیں کا اختؔر
یوں تو ہر موڑ پہ دیوار گماں ہوتی ہے

افسانہ

محمد یحییٰ جمیل

بون۔سائی

مجھے باغبانی سے زیادہ دلچسپی نہیں ۔پھر بون -سائی درختوں کے بارے میں کیا جانتا۔کل پرکاش سے معلوم ہوا کہ بون-سائی، چینی لفظ 'پین زائی' کا جاپانی تلفظ ہے۔'بون' یعنی ٹرےاور'سائی' یعنی درخت۔

''پھر بون-سائی کہنا چاہیے، بون-سائی درخت نہیں؟''

''جس سے بات واضح ہوجائے وہ کہنا چاہیے۔''اس نے مسکرا کر کہا۔ مجھے اس کی بات اچھی لگی۔آخر زبان ہماری سہولت کے لیے ہے۔

پرکاش سے چندروز قبل ہی میری دوستی ہوئی ہے۔اس نے پڑوس کا بنگلہ کرایہ پرلیا ہے۔اس بنگلے میں آنے والے ہر کرایہ دار سے میں دوستی کر لیتا ہوں۔ یوں زندگی کی یکسانیت کم ہوجاتی ہے۔انصاری صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نے اس بنگلے کو کرایہ پراٹھادیا۔اس کی بیوی کوامراوتی پسند نہیں اس لیے وہ ناگپور منتقل ہوگئے۔وکیل ہے کہیں بھی پریکٹس کرسکتا ہے۔

پچھلی مرتبہ یہاں ایک پروفیسرآ گئی تھی۔عمر کوئی پچاس پچپن کے بیچ رہی ہوگی۔ ہمیشہ ہلکے رنگ کی ساڑی پہنتی اورانتہائی باوقار لگتی۔صبح لان میں کتاب لے کر بیٹھی ہوتی۔اگراسے باہر نکلنے میں تاخیر ہوجاتی تو میں اس کا انتظار کرتا۔ پڑھنے والے افراد مجھے ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔اس کے باوجود میں نے اپنی دوستی، دیدارتک محدود رکھی تھی۔شام میں بنگلے سے کلاسیکل موسیقی کی بھی آوازآتی۔ کس قدراعلیٰ ذوق کی مالک تھی! وہ تنہا تھی۔اگرشادی کرلیتی تو اتنی خودمختار نہ ہوتی۔اورشایداس کی زندگی میں وہ انبساط نہ پیدا ہوتا جو، اَب ہے۔اُس کے جاتے ہی پرکاش یہاں آ گیا، گویا نمبر لگائے بیٹھا تھا۔عمر کے لمبےفرق کے باوجود وہ بہت جلد بےتکلف ہوگیا۔ ورنہ آج کے نوجوان ریٹائرڈ آدمی سے زیادہ بات کہاں کرتے ہیں؟ پھر وہ بیٹے ہی کیوں نا ہوں۔خیر، پرکاش بہت اچھالڑکا ہے۔ چندہی ماہ کے لیے آیا ہے۔اس کے گھر کارِنوویشن مکمل ہوتے ہی وہ چلاجائے گا۔

''آج کیوں دیرکردی؟'' مہتاب نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''ہاں، ذرادیرہوگئی، سأری۔''اور کیا جواب دیتا۔ پہلے دیا کرتا تھا اوراکثر تو تو میں میں شروع ہوجاتی۔ پھر جواب دینا بند کردیا تو بھی بحث کی گنجائش نکل آتی۔گفتگو کا یہ طرز ذرادیر سے آیا تھا۔

''کسی دوست کے گھر بیٹھ گئے ہوں گے، مجھے کیا بے وقوف سمجھتے ہیں......'' وہ بڑبڑائی۔

''چاے بنادوں؟'' میں نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

''کل شکرکم ہوگئی تھی۔تین چمچے ڈالنا۔''

مہتاب پیاری پھوپھی کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔مجھ سے زیادہ، دونوں خاندانوں کے لیے یہ رشتہ اہم تھا،سو ہوگیا۔ مجھے بھی کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔خاندان،خوبصورتی، دینداری سبھی کچھ تو تھا۔ بات شروع ہوئی اور میں گھوڑی چڑھا دیا گیا۔لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں والاتھرل ہی نہیں ملا۔لیکن مہتاب کا ایسا مزاج ہوگا، ابا جی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پڑوسیوں نے پہلی بار ہمارے گھر سے اونچی آوازیں سنی تھیں۔نو بیاہتا سہیلیوں سے سنے گئے رنگین قصوں نے مجھے بدذوق اورخشک مزاج شوہر ثابت کیا تھا۔بھرے پرے گھر میں ناز ونیاز کی گنجائش بھی کم تھی۔ایک سال بعد مجھے دوسرے شہر

میں ملازمت مل گئی۔ نئے شہر میں شفٹ ہوتے ہوئے سوچا تھا سال دو سال بعد واپس آ جاؤں گا، لیکن وہ دن پھر کبھی نہیں آیا۔ میں یہیں ریٹائر ہوا۔

نئے شہر میں بھی چین کہاں تھا۔ کچھ دوست بہت نالائق مل گئے۔ ویک اینڈ پر دیر رات تک بیٹھک ہو جاتی۔ مہتاب کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے غصے میں اپنی نسیں کاٹنے کی کوشش تھی۔ پڑوس کی عورتوں سے میل جول کو، جانے کیوں وہ عار سمجھتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی مرضی نے قانون کی شکل اختیار کر لی۔ امی، ابا جی صرف دو چار دن کے لیے آئیں۔ بھائیوں سے تہواروں پر ملاقات کروں۔ بہن سال میں ایک بار آئے اور دو دن سے زیادہ نہ ٹھہرے۔ سال میں صرف عیدین پر دعوت ہو۔ ویکیشن پر کوئی نہ آئے۔ دوست اگر آئیں تو طہارت خانہ ہرگز استعمال نہ کریں۔ ضروری کام سے جاؤں اور فوراً لوٹ آؤں۔ گھریلو کاموں میں بہر حال مدد کروں۔

''کمر میں بہت تکلیف ہے۔'' جب میں نے اسے چائے کی پیالی پکڑائی تو وہ دھیرے سے بولی۔

''ہوں۔''

''اگر آپ کو ایسی تکلیف ہوتی تو پل بھر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔''

کاش کسی نے درد کی پیمائش کا آلہ ایجاد کر لیا ہوتا۔ مگر کیا تب بھی میں کچھ کر پاتا؟ عرق النسا کے درد نے میرا جینا وبال کر رکھا تھا لیکن خیر۔

''ہوں، کل ڈاکٹر کو دکھا دیں گے۔''

''آپ کا کل، جلدی نہیں آتا۔''

سالوں پہلے میں نے مہتاب کو واکنگ کا مشورہ دیا تھا۔ پھر تین گھنٹے بری طرح پریشانی میں گذرے تھے۔ وہ مجھے بتائے بغیر اپنی کزن کے گھر چلی گئی تھی، پیدل۔ یہ اچھا سبق تھا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ اس لیے ہر تکلیف پر ڈاکٹر بہترین آپشن تھا۔ البتہ میں ہر شام گھومنے چلا جاتا ہوں۔ پرکاش کو بھی ایوننگ واک پسند ہے۔ کیا بات ہے!

''اچھا پرکاش، بون-سائی کی قیمت کیا ہوتی ہے؟''

''ڈیپنڈ کرتا ہے، دو، ڈھائی ہزار سے ایک لاکھ تک۔''

''اور اسے بننے میں کتنا وقت لگتا ہے؟''

''کسی دن نرسری آیئے، آپ کو بون-سائی کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا۔''

''ضرور۔'' مہتاب اگر اپنے بھائی کے گھر جائے تو موقعہ مل سکتا تھا۔ ایسے تو ممکن نہیں۔ مگر وہ پہلے بھی اپنے گھر بہت کم جایا کرتی تھی۔ پیاری پھوپھی کے انتقال کے بعد تو اس کا میکا ہی ختم ہو گیا۔ بھائی کے گھر بمشکل جاتی ہے۔ اس کی بھابھی نہیں چاہتی کہ یہ سواری وہاں اترے۔ بھائی خود نالاں ہو تو پھر بھابھی کا کیا کہنا۔

''کل چلیں؟'' پرکاش نے پوچھا۔

''ارے نہیں، بتاؤں گا تمھیں۔'' میں نے بات ٹال دی۔

رات کے کھانے پر میں نے پرکاش کی تعریف کی تو مہتاب کو بہت ناگوار گذرا۔

''اب آپ نے اسے پیچھے لگا لیا؟''

اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اسے کھانے پر نہ بلالوں۔ حالانکہ کسی دوست کو کھانے پر بلائے زمانہ بیت چکا تھا۔ اب تو کوئی دوست بھول کر بھی نہیں آتا۔ اس لیے عرصے سے چائے بھی نہیں پلائی تھی۔ جب میں شفٹ ہونے کے بعد پہلی بار گھر گیا تو امی نے کہا تھا، تیرے جانے کے بعد ایک لیٹر دودھ کم کر دینا پڑا۔ مہمانوں کی آمد سے انھیں خوشی ہوتی تھی۔ بہت سوشل تھیں۔ اللہ درجات بلند

کرے۔

پھر جس دن پینشن لینے بینک جانا تھا میں پرکاش کی نرسری پہنچ گیا۔ اس دن دیر بھی ہوجائے تو مہتاب خاموش رہتی تھی۔ پرکاش بہت خوش ہوا۔ سارا کام چھوڑ کر مجھے گھماتا رہا۔ پھر بون-سائی درختوں کے پاس پہنچ کر بولا،''ہمارے یہاں، پیپل، املی، نیم، فائی کس، بوگن ویلا، برگد، گل مہر، سنترا، آم وغیرہ کے بون سائی بنائے جاتے ہیں۔''

''بون-سائی بنتے کیسے ہیں؟''

''جس پودے کا بون سائی بنانا ہوا سے گملے سے نکال کر اس کی بڑی ڈالیاں کاٹ لیتے ہیں۔ جڑیں بھی کم کرتے ہیں۔ پھر اتھلے گملے میں کھاد اور مٹی کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔ اس کی غیر ضروری شاخوں اور پتوں کو کاٹتے رہنا ہوتا ہے۔ تاکہ اس کی لمبائی ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔''

''اس کی کھاد اسپیشل ہوتی ہے؟''

''نہیں، وہی عام کھاد ڈالی جاتی ہے۔ فائی کس اور پیپل کے لیے کھاد کے ساتھ مٹی کی جگہ باریک کرش ملایا جاتا ہے۔''

''دو سے تین سال بعد بون-سائی کا گملا بدلنا پڑتا ہے۔''

''ہوں...... دیکھو، کچھ سیدھے ہیں کچھ ذرا ترچھے، بالکل عام درختوں کی طرح۔''

وہ ہنسا اور بولا،''یہ بھی ہماری کاریگری ہے۔''

''اچھا!''

''المونیم کے تاروں سے ڈالیوں کو اپنی مرضی کے مطابق شکل دیتے ہیں۔ اس طرح ڈیڑھ دو سال میں بون سائی کی ابتدائی صورت بن جاتی ہے۔ یہ دیکھیے، یہ سیدھے تنے والا بون-سائی ہے اسے Formal Upright کہتے ہیں۔ Informal Upright میں اس کا تنا ٹیڑھا رکھا جاتا ہے۔ پہاڑوں پر تیز ہوا کی وجہ سے درخت جھک جاتے ہیں اس طرح کا لک دینے کے لیے Slanting Upright کیا جاتا ہے۔ Forest کا لک دینے کے لیے ایک برتن میں چار پانچ بون-سائی اگائے جاتے ہیں۔ یہ بون سائی بالکل جنگل کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔''

''یعنی کوئی چاہے تو جنگل خرید کر لے جائے۔''

''شوق سے......''

میں نے پرکاش کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھا:

''کر علاجِ وحشت دل چارہ گر
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے''

وہ مسکرا کر میری جانب دیکھتا رہا۔

''اردو کے ایک بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں، مومن خاں مومن۔ ان کا شعر ہے!'' میں بولا۔

''او کے، مجھے صرف دوسری لائن سمجھ آئی۔''

''کیا سمجھے؟''

''مومن صاحب کو یہ گفٹ کیا جاسکتا ہے۔'' ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ میں نے رومال سے آنکھیں صاف کیں، اور کافی پی کر گھر کے لیے نکل پڑا۔

پھر ایک دن پرکاش بھی چلا گیا۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے مجھے نیم کا ایک بون-سائی تحفے میں دیا۔ نہایت قیمتی گملے والا۔ بہت پیارا۔ میں نے اسے مومن کا شعر فریم کر کے دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میں نے بون-سائی بالکونی میں رکھ دیا۔ بنگلے کی جانب تاکہ اس کے ساتھ پرکاش کی یاد تازہ رہے۔

اس دن جب سونے کے لیے لیٹا تو نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ دیر تک جاگتا رہا۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ میں نے مہتاب کو دیکھا، وہ گہری نیند میں تھی۔ میں آہستہ سے اٹھا اور بون-سائی کے سامنے جا بیٹھا۔ یہ بون-سائی نیم،

گاؤں والے نیم کے درخت سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ نچلی شاخ تو بالکل ویسی ہے۔ اس بون- سائی کے نیچے چند بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے چشمہ اتار دیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اوہ، یہ تو میں اور میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ منی نمولیاں جمع کر رہی ہے۔ گھر کے آنگن میں وہ اِن کی دکان لگائے گی۔ اس نے سنہری رنگ کا شلوار کرتا پہنا ہے۔ آنکھوں میں بڑا سا کاجل لگا ہے۔ اس کے کتھیا بال، لال رنگ کے ربن سے بندھے ہیں۔ میں شاخ پر چڑھا اور کود گیا۔ 'آہ.....' میری چیخ نکل گئی۔ میرے پیر میں کانچ کا ٹکڑا گڑ گیا ہے۔ دونوں بھائی دوڑ کر آئے۔ ایک نے میرا پیر اپنی گود میں رکھ لیا۔ خون سے اس کا قمیص سرخ ہونے لگا ہے۔ دوسرا کانچ کا ٹکڑا نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ منی رو رہی ہے۔ ''بھیا آپ کو بہت درد ہو رہا ہوگا نا؟''

''نہیں، تو رومت۔''

''بھیا، آپ سے ملے دو سال ہوگئے۔ آپ کی بہت یاد آ رہی ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے اس کے آنسو پونچھے اور بیساختہ بون- سائی لے کر گھر کے آنگن میں چلا گیا۔ اب گڑھا کرنے کے لیے کسی چیز کی ضرورت تھی۔ اسٹور میں سلاخ مل گئی۔ کچھ ہی دیر میں بالشت بھر کا گڑھا ہوگیا۔ میں نے بون- سائی کو اتھلے گملے سے نکالا اور زمین میں لگا دیا۔ مٹی برابر کرنے کے بعد اس پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ ہلکی ہوا کے جھونکوں سے ننھا نیم لہلہانے لگا تھا۔ جلد ہی یہ چھتنار ہو جائے گا۔ اس کام سے فارغ ہو کر مجھے وہ ذہنی سکون میسر آیا جس کے لیے میں عرصے سے ترس رہا تھا۔

یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ فطرت کا گلا گھونٹ کر اسے بونا بنا دیں۔ اسے تناور درخت کیوں بننے نہ دیا جائے؟ آخر درخت اسی لیے تو ہے کہ پرندے اس پر گھونسلے بنائیں، اس کی شاخوں پر چہچہائیں، اس کے نیچے بچے کھیلیں، اس کے پھل کھائیں، کیڑے مکوڑے بھی اس سے اپنی غذا حاصل کریں۔ وہ بیچارہ تو سب کے لیے مفید ہے، پھر سب کو محروم کر کے اپنی تسکین کے لیے اس پر ظلم کیوں؟ بلکہ اپنی غرض کے لیے سب پر ظلم کیوں؟؟

OOO

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔٦

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔٨٢

منیشا کلشریشٹھ / احسن ایوبی

ہندی کہانی

گمشدہ پیلی تتلی

وہ چار سال کی تھی اور وہ وہاں کیوں تھی؟

اپنے گھر سے بہت دور، کئی گلیاں اور دو محلے، سات بڑے بڑے دروازے اور چڑھائیاں پار کر کے؟ کسی گھر کی اجنبی چھت پر اپنی فراک کے نیچے بغیر کچھ پہنے؟ محض ایک طوطے کی چاہ میں....؟

''اے بلّی جانتی ہے...؟ وہ طوطا بولتا ہے''۔

''میرا نام بھی بولے گا؟''

''ہاں! میری چھوٹی بہن پنکی کا تو نام بولتا ہے۔ تیرا بھی بولے گا''۔

''ڈی کے انکل! مگر بلی نہیں منّو''۔

''نہ منو نہ بلی... مس منالی بولے گا... ٹھیک ہے؟ اب چلیں؟''۔

☆☆

ایک پیلی تتلی لاپتہ ہوئی تھی۔

یہ اس کی زندگی کے ان دنوں کی بات ہے جب موسم، وقت اور عمر کی گنتی تک پتہ نہیں ہوتی تھی۔ ہر دن ایک متجسس روشنی کے لئے اگتا تھا۔ سورج باتیں کرتا، چاند کہانیاں سناتا۔ جب وہ پاٹھ شالا تک نہیں جاتی تھی تو ہر دن اس کے لئے ایک پاٹھ شالا ہوتا تھا۔ ہتھیلی پر رکھی ریشم کی بڑھیا اور بازو پر ساتھیوں کی چٹکی، ران پر چلتے مکوڑے کی گدگدی تک نئی لگتی تھی۔ پیٹ کی گدگدی ایک مزیدار کھیل ہوتی، کسی کی چھینک تک پر کھلکھلا دینے کے دن تھے۔ بڑوں کے جسم بہت بڑے لگتے چاہے کوئی تھوڑا ابڑا ہی کیوں ہو، واقعتاً بڑے تو بہت بڑے تھے۔ چھوٹا سا پارک وسیع وعریض لگتا اور ٹوائے ٹرین میں کود کر بیٹھنا بھی ایک مشکل مسئلہ ہوتا۔ ہمیشہ کھیلنا، کھانا، روز کچھ نیا جاننا اور اس سے متحیر ہونا۔ نو بجتے ہی کھیلتے کھیلتے گہری نیند میں سو جانا، صبح بستر پر موجودگی سے کچھ نہ یاد رہنا کہ کھیل والی جگہ سے یہاں کب اور کون لایا؟ کھانا کس نے کھلایا؟ اس کے پیارے بھولے دنوں کو ماں تہہ لگا کر تسلی اور یادداشت کی نیند کے بکسے میں رکھتی جاتی، تحیر خیزی کی وہ دلدادہ کچھ دنوں بعد تہہ کر کے رکھے ہوئے ان دنوں کو دوبارہ باہر نکال لیتی اور ان پر اپنے تخیل کی گلکاری کرتی۔

''کل جب ممی آپ پٹو کو لینے ہاسپٹل گئی تھیں نا، تب آپ نے ہمیں حلوہ بنا کر کھلایا تھا، نہرو پارک بھی لے گئے تھے''۔

ماں ہنستی ''منو کے لئے بہت دن پہلے بھی کل ہوتا ہے، جبکہ پٹو ڈیڑھ سال کا ہو چکا''۔

پاپا گرہ لگاتے ''دو دنوں کو مکس بھی کرتی ہے، کچھ چیزیں اپنی طرف سے گپ کر کے لگا دیتی ہے، یہ عمر ہے ہی تخیلات کی دنیا میں گم رہنے کی''۔

میں تب بھی بحث کرتی ''نہیں پاپا، میں سچ کہتی ہوں۔ کل جب میں ڈی کے انکل کے گھر گئی تھی نا..... تب میری پیلی تتلی گم ہوگئی... انہوں نے میری چڈی سے پکڑ کر فریم میں لگا دی''۔

یہاں آ کر بس میٹھی لتاڑ ملتی ''منو! بس اب جا کر اپنے رنگوں کی کتاب میں رنگ بھرو''۔

''منو عجیب وغریب ڈھنگ سے نہیں پیش آ رہی؟''

''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے.... کبھی کبھی میں اسے پاتی ہوں.... نہیں پتہ..... جیسے کہ وہ... مجھے ڈرا دیتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ سونے کا بہانہ کر کے جاگ رہی ہوتی ہے۔ وہ ابھی اس طرح بہانے بنائے... اس کے لئے بھی بہت چھوٹی ہے۔ وہ ہمیشہ تھوڑی عجیب رہی ہے.... موڈی''۔

''ہوسکتا ہے''۔
ماں کو بھنک بھی نہیں لگی کہ منو آہستہ سے دوسری ہی قسم کی بچی ہو چلی ہے ،وہ ہمیشہ گڑیوں کے ساتھ پراسرار کھیلوں میں الجھی رہنے لگی۔گڑیوں کو خریدنے سے پہلے وہ ان کی فراک الٹتی ،جن گڑیوں نے چڈی نہ پہنی ہوتی وہ ان کو خریدتی ہی نہیں۔اپنی پرانی گڑیوں کے لئے وہ ممی سے ضد کرتی کہ ان کی چڈیاں سل دیں۔اس کی اس سنک پر ماں جھنجھلاتی ۔وہ کونوں میں ،پردوں میں چھپ کر کھیلتی ،چھاتوں کے گھر بنا کر اکیلی کھیلتی۔اس نے پٹو کو اپنے کھیلوں سے بے دخل کر دیا تھا۔

☆☆

اسے منو سے منالی ہوئے عرصہ ہوگیا۔ممی آج بھی مصروف ہیں ۔وہی دفتر ہے مگر آج وہ اس کی ہیڈ ہیں۔ڈی کے بھی اب ان کے دفتر کا ہیڈ کلرک ہے۔اس چھوٹے شہر میں وہ مقبول آدمی ہے کیونکہ ملنسار ہے۔اپنے آپ میں وہ آج بھی دلچسپ آدمی ہے۔شہر کے ہر آدمی کو وہ جانتا ہے،شہر کا ہر آدمی بھی اس سے واقف ہے۔وہ شہر کے نام پتوں کی ڈائریکٹری ہے،شہر کی تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔اسے 'مخصوص'اوراہم بنانے والی بہت سی چیزیں ہیں ..... پرانے سکوں اور ڈاک ٹکٹوں کا منفرد کلیکشن، یہاں وہاں سے پکڑی گئی تمام قسموں کی رنگ برنگی تتلیوں کے فریم،مانسرو ور یاترا سمیت مختلف ٹورز کے دلچسپ تجربات،فوٹو البم...جن میں سنے اسٹاروں اور لیڈروں کے ساتھ اس کی تصاویر ہیں اور باتوں کا دھنی تو ڈی کے ہے ہی۔وہ آج بھی شہر میں اسی نام سے جانا جاتا ہے، ہر معزز گھر میں اس کی آمد و رفت ہے، ہر دکھ اور ضرورت میں آگے،اب اس کی بیوی بھی ہے اور اسکول جاتے بچے بھی ، بیوی بھی خوب گھلنے ملنے والی خوش مزاج عورت ہے۔

منالی تین سال کی تھی جب اس شہر میں بس سے پاپا کی انگلی پکڑ کر اتری تھی۔تب وہ منو تھی،ممی کی گود میں ننھا بھائی پٹو تھا۔اس دن منو قلعہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی ،قلعہ بھی تو پورے شہر کو گھیرتا ہوا سا تھا۔ٹھیک اس دن سے وہ ڈی کے کو جانتی ہے۔ڈی کے کو دفتر والوں نے ممی پاپا کے استقبال اور سرکاری کوارٹر میں شفٹنگ میں مدد کے لئے بھیجا تھا۔کھیل کود کے شوقین ہر بچہ کی طرح منو کو بھی باتونی ڈی کے بہت دلچسپ لگا تھا۔بس وہ کالج سے بی اے کر کے نکلا ہی تھا۔لمبا.....بہت لمبا...سانولا.....اورکپل دیو جیسی مونچھوں والا۔اس کا سامنے اور اوپر والا ایک دانت کونے سے کھسکا ہوا تھا اور ایک نقلی تھا جسے وہ زبان سے باہر نکال کر منو کے سامنے تفریح کرتا۔وہ ممی کے دفتر میں عارضی کلرک تھا،منو اسے بھائی صاحب یا چاچا جی نہیں کہتی تھی......اس کی زبان پر ڈی کے انکل ہی آتا۔
ڈی کے انکل کے گھر اور دور قلعے کے اوپر بسے محلّہ میں ان کے گھر کے بیچ کا پڑاؤ ہی تھا منو کا گھر۔جہاں ڈی کے ہر دوسرے دن چائے پینے ،فائلوں پر دستخط کروانے اور منو سے کھیلنے رکتا تھا۔دفتر کے دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی ڈی کے نے بھی ممی پاپا اور منو پٹو کو گھر پر کھانے کے لئے بلایا تھا۔وہ سب سرکاری گاڑی میں پہلی بار قلعہ پر گئے۔منو نے فوراً قلعہ سے رشتہ بنالیا۔کھنڈر، بڑے بڑے پول....پول یعنی کہ داخلی دروازے نہ کہ کھمبے.....پہنائیاں.....کہانیاں اور نیل گائیں....ڈی کے انکل کا بھول بھلیاں گھر اور طوطا جو بولتا تھا۔قلعہ کا وہ سفر اتنا دلچسپ تھا کہ منو دوبارہ اس سفر کی آرزومند تھی۔ایک دن ممی کے ساتھ ہی ساتھ ڈی کے انکل سائیکل پر فائل لے کر آگئے۔منو دوڑ کر گود میں چڑھ گئی۔
''انکل طوطا رام کیسا ہے؟''

’’تجھے یاد کرتا ہے، پوچھتا ہے کہ وہ بلی کہاں ہے؟ اب تو گھر کے پچھواڑے میں خوب امرود بھی اگے ہیں، گومکھ کا تالاب لبالب پانی سے بھرا ہے، چنے کھانے والی مچھلیاں یاد ہیں؟‘‘

ڈی کے نے ممی کو دیکھ کر آہستہ سے دبلی پتلی ٹانگوں والی منو کو صوفے پر اتار دیا۔

’’ممی! ہم کب جائیں گے قلعے؟ دیکھو نا ڈی کے انکل کیا کہہ رہے ہیں‘‘۔

’’منو کام کرنے دو، جائیں گے کسی سنڈے کو‘‘۔

ممی چشمہ سنبھالے فائلوں پر پین چلاتی رہیں۔ وہ ڈی کے کی گود میں مچلتی رہی۔

’’کل سنڈے ہے، کل چلیں؟‘‘ ممی نے جواب نہیں دیا لیکن ڈی کے انکل نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا کہ میں کچھ کرتا ہوں۔ فائلیں پوری ہوگئیں تو چائے آگئی۔

’’میڈم! منو کا اتنا جی چاہ رہا ہے پنکی اور طوطے سے ملنے کا ممی بھی پوچھ رہی تھیں تو میں لے جاؤں؟ شام تک چھوڑ دوں گا‘‘۔

’’سائیکل پر؟‘‘

’’ہاں‘‘۔

’’اتنی دور؟‘‘

’’ممی کل آجاؤں گی، جانے دو نا، ہم کو پنکی سے ملنا ہے، ہم کو امرود کھانے ہیں، گومکھ کی مچھلیاں دیکھنی ہیں‘‘۔

’’پاپا سے پوچھنا ہوگا‘‘۔

’’پاپا دیر سے آئیں گے ممی، تب تک ڈی کے انکل چلے جائیں گے‘‘۔

منو زمین پر بیٹھ کر مچلنے لگی، ڈی کے نے پھر اسے گود میں لے لیا، منو نے ڈی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، ممی کشمکش میں مبتلا ہوگئیں۔

’’اب تم کو اسکول میں ڈالنا پڑے گا، تم بہت ضدی ہو منو‘‘۔

’’تم ہم کو کہیں نہیں لے جاتیں، میرے ساتھ کوئی نہیں کھیلتا، پٹھو کو پیار کرتی ہو آپ، مجھے نہیں، گھر کا سارا دودھ پٹھو پیتا ہے، مجھے تم دودھ نہیں دیتیں‘‘۔

’’یکی بلی ہے تو منو، اب میں تجھے بلی ہی کہوں گا‘‘۔

’’اور پٹھو کو؟‘‘

’’چوہا‘‘

’’میڈم! پھر لے جاؤں اسے؟‘‘

ممی کا جواب یاد نہیں منو کو، لیکن وہ دلچسپ سفر یاد ہے۔ وہ سائیکل کے اسٹینڈ پر پیچھے بیٹھی ہے، پیروں میں ننھے لال جوتے لٹکے ہیں، شہر کی جگ مگ روشنیاں ختم ہوتی ہیں..... پاڈن پول کے بعد گھپ اندھیرا....ڈی کے احتیاط سے سائیکل چلاتا جا رہا ہے... باتیں کر رہا ہے۔

’’بلی! تجھے کھانے میں کیا پسند ہے؟‘‘

’’مجھے روٹی بالکل نہیں پسند‘‘۔

’’تجھے پتہ ہے یہاں شیر بھی ملتے ہیں؟‘‘

’’ڈر لگ رہا ہے انکل‘‘۔

’’ڈرنے کی بات نہیں، میں تو روز آتا جاتا ہوں‘‘۔

’’آپ کو ملا؟‘‘

’’ایک بار سامنے سے گزرا، لومڑیاں تو تجھے آگے نظر آجائیں گی‘‘۔

بیچ میں لکشمن پول، ہنومان پول کے موڑ پر بچوں کے ساتھ جاتی ہوئی لومڑی نظر آئی۔ ایک بڑے پیڑ سے اتر کر دوسرے پیڑ پر بھاگ کر چڑھتا بجو دیکھ کر منو چیخ پڑی تو ڈی کے نے سائیکل پر آگے بٹھا لیا۔ پیڈل مارتے وقت ڈی کے کی چھاتی کا اس کے سر پر دباؤ اسے مطمئن کرتا رہا۔ قلعہ پر بسا محلّہ چھوٹا ہی تھا۔ ڈی کے کا گھر.....یعنی آج بھی رونقیں ہی رونقیں ...سات بھائی بہن....ہر عمر کے...طوطا، ایک السیشین کتا شیرو، ڈی کے کی ممی یعنی نانی جی، ڈی

کے پاپا نانا جی، ڈی کے کے جمع کئے گئے سکے، البم، بڑا احاطہ، گھر کے پیچھے قلعے کے ٹوٹے کھنڈر، چمگادڑیں، رات میں باگھ کی دہاڑ۔
پہنچتے پہنچتے رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ وہاں سب نے اسے گھیر لیا میٹھی باتیں کیں۔ سب کے ساتھ اس نے کھانا کھایا۔ شہر سے قلعہ پر آنے میں سات کلومیٹر کا چڑھائی والا سفر، طوطے، پنکی سے لڑائی اور انگلی میں طوطے کے کاٹ لینے سے وہ روہانسی ہوگئی۔ اسے ممی کی یاد آنے لگی، ڈی کے کے سارے چھوٹے بھائی بہنوں نے اسے منانے کی کوشش کی، رنگین پنسل دیں، مگر وہ منہ لٹکائے بیٹھی رہی۔ اپنے والد کے کمرہ میں کچھ دیر ٹھہر کر ڈی کے نے نہایا اور کچن میں کھانا کھا کر ہی اس کے پاس آیا۔ پوچھا ''منو نے کھانا کھایا؟'' منو گھر سے لایا ہوا اپنا چھوٹا سا بیگ چپکائے بیٹھی تھی۔
بہنوں کے کمرے میں منو کو روہانسا دیکھ کر پوچھا ''کیا ہوا؟'' تو وہ رو پڑی ''ممی کے پاس جانا ہے''۔
''کل جائیں گے نا، ابھی رات میں شیر مل جائیں گے راستے میں، تو نے آواز نہیں سنی یہاں دہاڑ کی؟ ہاں! لیکن تو ڈری نہیں نا؟ تو تو بلی مَوسی ہے شیر کی، چل تجھے کہانی سناؤں''۔
بہنوں کو پڑھتا دیکھ کر وہ وہاں سے منو کو لے گیا۔ اس کا کمرہ چھت پر تھا، جیسا کہ اس زمانہ میں گھر کے بڑے لڑکوں کے کمرے چھت پر ہوتے تھے۔
''دکھاؤ تمہارے بیگ میں کیا ہے؟''
اس کے بیگ میں ایک فراک تھی، ایک ننھا ٹوتھ برش، ایک چمکیلا ربن، سنہرے بالوں والی لچکدار سر کی ایک گڑیا۔
''تم گڑیا چھوڑو، میں تمہیں جادوئی چیزیں دکھاؤں''۔
وہ اسے گود میں اٹھا کر کمرہ سے متصل بیٹھک میں لے گیا، جہاں چار بڑے بڑے فریموں میں کئی رنگوں، قسموں اور سائز کی مردہ تتلیاں قید تھیں۔ وہ مری ہوئی تتلیوں کا البم دکھانے لگا۔ وہ انہیں دیکھ کر ناخوش تھی۔ اس نے رونے والی اپنی ادا میں نچلا ہونٹ باہر نکال دیا۔
''انکل! ان کو اڑادو... ان کو اڑادو باہر''۔
''یہ بند ہوگئیں، اب نہیں اڑیں گی کبھی''۔ وہ بولا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
یہ دیکھ کر وہ ٹکٹ البم اور الگ الگ بٹوؤں میں رکھے تانبے کے سکوں کو نکال لایا۔ تھکی ہوئی روہانسی منو کچھ دیر ان سے کھیلتی ہوئی سو گئی۔ وہ کچھ پڑھتا رہا پھر لائٹ بند۔ لائٹ بند ہوئی... پلکیں بھی بند ہوئیں... لیکن رات جاگتی رہی۔ آگہی، بے خبری اور خواب کے بیچ وہ پیلی تتلی کنمنائی اور پھر شعور کی سطح سے اڑ گئی۔
اگلے دن دوپہر ہونے تک وہ گھر آ گئی۔ اتوار کی دوپہر ممی خود کھانا بنا رہی تھیں، پٹھو سو رہا تھا، پاپا دوردرشن دیکھنے میں مصروف تھے۔
''تو کب آئی منو؟ ڈی کے اوپر نہیں آیا؟ کیا کیا منو نے ڈی کے گھر؟ امرود کھائے؟ طوطے رام سے کھیلی؟
''گندہ طوطا... اس نے کاٹا میری انگلی کو، امرود کھائے لیکن کچے تھے ممی... بہت کچے... طوطے نے بھی نہیں چھوئے''۔
''مچھلیاں؟''
''نہیں دیکھیں... ہم کو گھر آنا تھا، آپ کی بہت یاد آئی۔ ممی! ڈی کے انکل گندہ ہے، تتلیاں بند کرتا ہے فوٹو میں۔ اسی لئے اس نے میری پیلی تتلی والی چڈ....''۔ منو نے شہد جیسی بھولی آنکھیں نم کر کے، ہونٹ باہر نکال کر روہانسی ہو کر کہا۔ ممی نے کھیر کا کٹورہ پکڑا کر کہا ''جا کھا لے''۔
اگلا دن منو کے لئے دھند سے گھرا ہوا سا تھا۔ اپنے آس پاس کے لوگوں میں اس کی دلچسپی جاتی رہی۔ اس دن پاپا لوٹے تو وہ دوڑ کر پاپا کے پیروں سے نہیں لپٹی۔ اسی سال اسکول جانا شروع ہوا تو بستے، کاپیوں اور اسکول کے دوستوں نے روزمرہ معمولات کو بھر ڈالا۔

☆☆☆

اب منالی کی شادی ہونے والی ہے۔ساتھی خوبصورت اور راستہ نیا ہے۔روز فون پر پیار ومحبت کی باتیں ہو رہی ہیں،کورٹ شپ کے دن خوبصورت بیت رہے ہیں ۔نہ مِنّو منی ہے نہ ڈی کے کا بلی والا۔وہ اب بھی اسے بلی کہتا ہے اور پنٹو کو چوہا، جو نہ پنٹو کو پسند ہے نہ منالی کو۔دونوں اس کے اس مذاق پر منہ بناتے ہیں۔پنٹو اور منالی کا رشتہ ایسا ہے کہ دونوں بغیر کہے ایک دوسرے کے جذبات سمجھتے ہیں.....تلے اوپر کے بھائی بہنوں کی طرح۔

ڈی کے برسوں سے حاصل اعتماد کے تحت ایک طرح سے گھر کا قریبی دوست ہو چکا ہے۔لمبا قد،سانولا چہرہ،تیکھی ناک،ہمیشہ رسمی لباس،ترتیب سے سنبھلے بال،سنجیدہ ومتین آواز ،ہمیشہ اپنائیت وخلوص کے ساتھ کسی بھی قسم کی مدد کے آمادہ۔شہر نے اسے اپنا غیر معلنہ ثقافتی ترجمان سا بنا دیا تھا۔شہر کے ہر معزز گھر میں اس کا داخلہ آسان،شہر کے ہر پروگرام میں وہ موجود۔

آج منالی کی شادی والی پوشاک سل کر آئی ہے۔وہ پرشوق انداز میں اسے پہن کر دیکھ رہی ہے.....آئینہ کے سامنے گھوم گھوم کر......۔پرانا آئینہ حیران ہے۔یہی آئینہ گواہ ہے منالی کی ہر عمر کا ۔اسکول کے فنکشنز میں پہنے لہنگے اور اور آج کے اس لہنگے میں فرق ہے ایک وقت کا۔اسے آنے والی اکیس تاریخ کو سب سے زیادہ حسین نظر آنا ہے۔وہ اپنا ہنس جیسا جسم موڑ موڑ کر کرتی اور کانچلی کی فٹنگ دیکھ رہی ہے۔چل کر،گھوم کر،سر پر اوڑھنا رکھ کر،شرما کر طرح طرح سے بن سنور رہی ہے،البیلی نگاہوں کی مختلف اداؤں میں سے ایک چن رہی ہے،بوسہ کے لئے وہ ہونٹ آئینہ کی طرف بڑھا رہی ہے کہ.........اس کی پرائیوسی کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ ڈالتا ہے،کسی نے اسے پیچھے کندھوں سے تھام لیا ہے.....ڈی کے انکل!!!!وہ تمتما گئی.....وہ اس کے سینہ پر کہنی گاڑ کر سیدھی ہو گئی۔

''پرنسز لگ رہی ہے میری بلی،صحیح وقت پر آیا میں''۔ڈی کے چہرہ پر وہی گھٹیا جذبہ پُتا تھا جو بسوں میں ان آدمیوں کے پتا رہتا ہے جو دانستہ لڑکیوں کو چھو کر چلتے ہیں اور مڑ کر دیکھو تو عجیب سنجیدگی اور لا تعلقی کا جذبہ اوڑھ لیتے ہیں لیکن ہوس اس سنجیدگی کے پیچھے سے بے محابا نمایاں ہو جاتی ہے۔

''نہیں!!! یہ غلط وقت ہے...بغیر کھٹکھٹائے ہوئے میرے کمرہ میں آنے کا،وقت وہ بھی غلط تھا ڈی کے انکل آپ کا اپنے کمرہ میں مجھے لے جانے کا۔یہ بتایئے بیس سال پہلے میں اس چھت پر صبح پانچ بجے واش بیسن کے نیچے اپنی فراک اٹھائے ہوئے کیا کر رہی تھی؟''۔منو پہلے پھسپھسائی پھر چیختے ہوئے ہکلانے لگی۔

''پاگل ہوئی ہے؟ کیسے سوال کر رہی ہے؟ میڈم،ماٹ ساب سے الگ ہونے کا تجھے صدمہ تو نہیں لگ گیا؟ کیا بیکار کی باتیں یاد.......''۔وہ پچکارنے لگا۔

''انکل! مجھے بہت غلط وقت پر یہ سب یاد آ......... پتہ نہیں آج مجھے کیوں یاد آیا لیکن انکل آپ ابھی نکلو یہاں سے''۔

''کیا بات ہے منو؟....ہاں ڈی کے انکل!!!! آپ اس وقت یہاں کیسے؟ آپ کے آتے وقت میری نظر آپ پر کیوں نہیں پڑی؟ ۔شام کو آیئے.....پاپا شام کو آتے ہیں''۔

منو پائپ سمیٹتا ہوا اندر آ گیا۔

ڈی کے کینچوے کی طرح رینگ کر اسی طرح نکل گیا جیسے اس روز نیچے اسے سیڑھیوں میں ہی چھوڑ کر نکل بھاگا تھا۔منالی لہنگا پہنے ہوئے ہی اپنے بستر پر اوندھے منہ ڈھے گئی۔اس کی یاد داشت کا خوابیدہ لاوا دھواں دے رہا تھا،اذیت کی اتھاہ اور بغیر باندھ والی ندی سی امڈ پڑی ہے جو پیروں کے بیچوں بیچ اپنے مطلوب نقطہ کی طرف بہہ رہی ہے۔وہ اپنی سوچوں میں غرق ہو گئی۔''برسہا برس گزر گئے لیکن سچ....تخیل....اور گڈمڈ وہم کو الگ کرنے میں اب بھی

کبھی الجھن محسوس کرتی ہوں۔اس رات میں نے گرم ہاتھ اپنے بدن پر محسوس کئے تھے؟یا وہ ٹھنڈے تھے؟یا میرا بدن ہی ٹھنڈا پڑا تھا؟اس کے بعد کی چیزیں کیوں دھندلی ہو جاتی ہیں؟ کیا میری یادوں کے ساتھ کسی نے چھیڑ چھاڑ کی؟کس نے انہیں بدل ڈالا ؟کس نے مٹا یا اریزر(Eraser)سے؟میں نیم خوابیدہ تھی...مجھے پتہ ہے.... ہاتھ تو مگر وہ...لمس کیا تھا؟وہ ہاتھ نہیں تھا...وہ عجیب سا لمس کپڑے کا بھی نہیں تھا.....گنگنا....لجلجا...مگر سخت...!!!!اور میری چڈی؟؟؟؟جس پر ایک پیلی تتلی کڑھی تھی....وہ کہاں ہے؟۔

آخر کار اس لمس کی گمشدہ کڑی اسے بہت بعد میں ملی۔تکلیف دہ بات یہ تھی کہ زندگی کے سب سے حسین دنوں میں ملی۔شادی سے پہلے کے خواب و خیال کے دن.....شادی بھی اس سے جس سے ملتے ہی منالی نے اپنے الہڑ شباب کے بالوں میں پروئی ہوئی ساری پتیاں سونپ دی تھیں۔

'سجل'۔

ان دونوں کی پڑھائی اب پوری ہو چکی تھی۔وہ دوسرے شہر کے ایک اسپتال میں اپنی انٹرن شپ کر رہا تھا کہ ان کی سگائی کر دی گئی۔سجل کے جانے سے پہلے وہ ملے اس کے گھر....اس کے اپنے کمرہ میں۔

''سنو منالی! کورٹ شپ کے دن دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے''۔

''تو بہتر دن آتے رہیں گے.....ہر پل ایک ساتھ رہنے کے''۔

''نہیں....ان دنوں کی بات ہی الگ ہے...باغ سے چوری کئے گئے امرودوں جیسی''۔

یہ کہہ کر وہ تجسس وانکشاف کی دلداہ کو چومتا ہوا اپنے کمرہ کے گنگنے کونے میں لے گیا۔ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے وہ لکڑی کے فرش پر بچھے نیلے مخملی قالین پر ڈھہہ گئے....کپڑوں کے نیچے چھپی ازلی دنیا کو ٹٹولتے ہوئے....ہونٹوں اور زیر و زبر ہوتے سینوں کی جانی پہچانی دنیا سے اور تھوڑا آگے ایک دوسرے کی 'پرائیویسی' کو جاننے کے لئے بے قرار دو جوان ..مگر ایک ہوتے ہوئے وجود۔تلاش سکھ ہی کی تھی مگر گڈ مڈ پوٹلیوں میں جو منالی کے ہاتھ لگا وہ کیمسٹری لیب میں کیروسین میں رکھے سوڈیم کے ٹکڑے جیسا تھا......ہتھیلی جلاتا ہوا کچھ.....

وہ باتھ روم میں جا کر کانپتی رہی تھی۔اس کے گڈ مڈ تخیلات، سچ اور وہم سے نکلی وہی پرانی کڑی!!!

وہ تحت الشعور میں گھستی چلی جا رہی تھی۔سجل کی موجودگی میں ہی اس کا شعور تحت الشعور سے پوچھ رہا تھا.....''یہ لمس....بچپن کے کسی بل سے نکل کر چلا آیا تھا...بنا زہر والے...ڈھیلے مار کر ادھ مرا کر دئے گئے سانپ سا.... ہلکا سا کانپتا ہوا اور لجلجا..... پہلے بھی چھوا ہے اسے میری جلد نے....اسی ادھ مرے سانپ کو....ہلتے ہلتے....میں نے اپنی رانوں میں سرکتے محسوس کیا ہے۔لگا تار لسلسی رال اگلتا سانپ....اس روز جو قلعہ والے گھر میں ڈی کے نے میری رانوں پر چھوایا تھا....وہ ڈی کے کا.....؟؟میں اس وقت کچھ نہیں جانتی تھی نا....لیکن مجھے تو اب بھی بھنک نہیں تھی....ان گرم، آوارہ لمسوں کا انکشاف مجھ پر اب تک کیوں نہ ہوا تھا؟''۔

منالی کو لگا کہ ایک رومانی قسم کی لڑکی سے وہ کس قسم کی چھوئی موئی میں تبدیل ہو گئی؟جسم کی ساری متحرک سلوٹیں، لہروں میں ڈوبے سارے زاویے، سرسراتی ادائیں یعنی مکمل وہ خود بے معنی ہوتی جا رہی ہے.سجل نے سوچا ہو گا کہ یہ اس کی حیا ہے، یہ چوری کے امردوں کا لمس اسے بری طرح بدحواس کیوں کر گیا؟۔

''تم اتنی نروس کیوں ہو؟شروع میں اتنی رومانی اور ایڈونچرس ہو رہی تھیں''۔

''سجل!میں ڈر گئی''۔

''مجھ سے ڈر گئیں؟میں تو کچھ بھی زبردستی نہیں....''

''نہیں..وہ بات نہیں ہے، مجھے عجیب سا لگا وہ لمس....پلیز مت پوچھنا.....''

''ٹھیک ہے.....جب مرضی ہو بتا دینا''۔وہ تسلی آمیز ڈھنگ سے مسکرایا، پھر وہ دونوں شاپنگ کے لئے نکل گئے۔

سجل کے واپس جانے کے بعد وہ اس رات سوئی ہی نہیں۔اسے محسوس ہونے لگا جیسے ان لمحات کو اس نے تحت الشعور میں بار ہا بسر کیا تھا۔بیتے بیس برس کی مار سے بے اثر رینگتا ہوا وہ لمس اس کے وجود میں کہاں کہاں کھوہ بنا چکا تھا۔جاگتی ہوئی ادھیڑتی رہی اس رات کو.....اس کی پسلیوں میں قید خوفزدہ پرندہ جیسا اس کا من چیختا رہا''نہیں منو!....مت کریدو اندرون کو..''۔

آخر کار وہ رات بے پردہ ہوگئی۔

اس رات اس نے لاڈ سے لپٹا کر سلایا تھا۔سب کچھ ٹھیک تو تھا۔درمیانی رات تک اس کے ہاتھ میرے چھوٹے سے دھڑ کو لپیٹے ہوئے تھے۔پتہ نہیں مجھے برا لگ رہا تھا یا ٹھیک یا اچھا...پتہ نہیں ... بالکل نہیں پتہ کہ یہ اچھی چیز ہے یا بری۔البتہ اس کی تیز سانسیں مجھے ضرور ناگوار لگ رہی تھیں۔پھر یادداشت ساتھ چھوڑ دیتی ہے ۔خیال ہاتھ تھام لیتا ہے۔چھوٹی ہوئی کڑیوں کے منظر خود بخود لگانے لگتا ہے۔پھر جھنجھلا کر میں ہار مان لیتی ہوں۔نہیں ایسا نہیں تھا ڈی کے.....محض خیال ہے...میرا تحت الشعور کچھ کا کچھ بُنتا ہے۔کیونکہ پھر اور کبھی تو اس نے کبھی نہیں.......وہ بظاہر ایسا نظر بھی نہیں آتا....بعد کے برسوں میں بھی کبھی کچھ ایسا نہیں.......مگر اس دن آئینہ کے آگے...؟غ....ل...ط..ف....ہ....م....ی؟''

اسے یاد آرہا ہے....اس رات کچی نیند میں وہ بے خبری سے باخبری کے بیچ پھیلی خاموشی کو بھانپتی رہی تھی۔اس وقت تک جب تک اس نے اپنا ہاتھ اس کے نچلے پیٹ پر لپیٹ دیا تھا۔چھاتی پر رکھا کوئی تکیہ سا ڈھکیلا اس نے ......سینے پر رکھے وزن کی وجہ سے برے خواب آرہے تھے کہ ایک بھوت ہاتھ کھینچ رہا ہے اور اس کا ہاتھ کسی گڈھے میں ڈال رہا ہے۔تکیے میں بال کیوں تھے؟ یہ کیسے لمسوں کا زلزلہ تھا؟اپنی دبلے پتلے چڑیا جیسے جسم کو وہ کسی گرفت میں پا کر پھڑ پھڑائی ،پھر گہری نیند میں کسی کیڑے نے اس کے ہونٹ کاٹے؟اس کی نیند میں پل بھر کے لئے ہوش داخل ہوا تو وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ڈی کے نے تھپتھپایا....سوجا....سوجا..ڈر گئی....سوجا۔وہ سفید چادر اوڑھے تھا۔وہ پلٹ کر ڈی کے سے دور کھسک کر، چادر پیر سے ہٹا کر پھر سوگئی۔گہری نیند کے دہانے پر پہنچی تو تو گھات لگا کر لجلجا سانپ رینگا۔ران سے مس ہوتا ہوا....گیلی لکیر چھوڑتا ہوا...جانے کیا ہوا...وہیں مر گیا۔کسی نے اس کی لاش اٹھا کر اندر کہیں سرکا دی۔چڈی گیلی جب محسوس ہوئی تو اس وقت امرود پر چڑیاں بول رہی تھیں۔صبح تک باتیں کرتے رہ گئے ستارے ٹم ٹم کر رہے تھے۔ڈی کے اسے صاف کر رہا تھا۔

''تم نے بستر گیلا کیا''۔

منو بے حد شرمندہ۔

وہ دن اس کے اندرون میں الجھنوں،خساروں اور جھنجھلاہٹ کے ربر بینڈ لگے بنڈل کی طرح کسی دراز میں پڑا رہا ہے۔پتہ نہیں یاد ہے کہ نہیں لیکن شاید لوٹتے وقت آوارہ اڑتی ہوئی مدھو مکھی نے بھی مجھے کاٹ لیا تھا۔اس لئے دو دن ہونٹ پر سوجن رہی تھی.....بخار بھی تھا۔

دوپہر،گھر کے باہر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے اپنا پیر چبوترے پر جمائے ہوئے ،اسے کمر سے پکڑ کر لال بلڈنگ کی دوسری سیڑھی پر اتارتے ہوئے منو کے ہونٹوں کی سوجن دیکھ کر ڈی کے نے یہی کہا تھا''تمہارے ہونٹ سوج گئے ننھے بچے۔ممی کو بتانا مدھو مکھی نے کاٹا ہے،لیکن بستر گیلا کرنے والی بات مت بتانا ،جلدی سے جا کر دوسری چڈی پہن لینا''۔

''لیکن میری تتلی والی چڑی کہاں گئی ڈی کے انکل؟''۔نہ جانے کیوں اسے یقین ہوگیا کہ اس پر بنی اڑتی تتلی اس نے مار کر فریم میں لگادی ہوگی۔

''تم نے گیلی کی،ہم نے پھینک دی''۔

''لیکن میں نے گیلی نہیں کی تھی''۔سیڑھی پر کھڑے کھڑے روہانسی منو نے سوچا تھا کہ وہ تو سونے سے پہلے'پی' کرنے گئے تھی۔وہ ساتھ گیا تھا....چھت کی کھلی نالی پر...وہ ٹھیک سامنے کھڑا تھا.... پاپا کی طرح پلٹ کر نہیں۔

''چل اوپر جا''۔ہمیشہ پیار سے بولنے والے ڈی کے کی آواز میں پیچھا چھڑانے والی پھٹکار منو نے محسوس کر لی تھی۔

''آپ اوپر چلو نا انکل!'' وہ کہتی تب تک سائیکل بڑھا کر وہ گلی میں مڑ گیا۔دیواروں سے سٹ کر سانس سانس کے ساتھ سرکتے ہوئے اس نے سیڑھیاں پار کیں۔دروازہ سے ہی پتہ چل گیا....گھر میں ٹی وی دہاڑ رہا تھا،اس میں ہمت آئی اور وہ گھر میں داخل ہو گئی۔بھاگ کر اپنی اور پٹھو کی الماری سے دوسری چڈی نکالی اورزمین پر بیٹھ کر پہن لی۔تب ماں کے پاس کچن میں گئی۔وہاں الائچی پڑی ہوئی کھیر کی مہک پھیلی تھی۔وہاں اس کا جی بہل گیا۔

☆☆

ماں آفس سے آگئی ہے۔بہت کم چائے پینے والی منالی نے پہلی بار دو کپ چائے بنا کر ٹیبل پر رکھ لی ہے۔ایک مضبوط تمہید کے بعد منالی نے ان کو مخاطب کیا''ممی! آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے''۔

وہ چونکی ہیں،کیونکہ بیس دن بعد شادی ہے۔لڑکی کوئی دھما کہ تو نہیں کرنے جا رہی؟ موڈی تو ہے ہی بچپن کی۔

''بولو''۔

''مجھے لگتا ہے ڈی کے نے بچپن میں میرے ساتھ کچھ کیا تھا''۔

''کب کی بات کر رہی ہو منالی؟''

''میری یادیں دھندلی ضرور ہیں لیکن وہ سچ ہے۔جب ہم لال بلڈنگ میں رہتے تھے۔نئے آئے تھے یہاں۔وہ سائیکل پر بٹھا کر اپنے قلعہ والے گھر لے گیا تھا''۔

''اس وقت تو تم بچی تھیں''۔

''وہی تو کہہ رہی ہوں.... بچی تھی۔بڑی ہوتی تو ایسا کر سکتا تھا وہ؟''

وہ ہلکا سا گھبرا کر پوچھ بیٹھیں''ریپ....جیسا کچھ؟''

''اس کو ریپ نہیں کہیں گے...لیکن کچھ گندے ارادے والی گندی حرکتیں تھیں ممی،جو ریپ نہیں ہوتیں لیکن اس سے بھی زیادہ خطرناک....''۔

وہ حیرت زدہ ہوئیں۔اسے امید تھی کہ ان کا چہرہ پیلا پڑے گا،وہ بدحواس ہوکر سر پکڑ لیں گی اور آئندہ اسے گھر نہ آنے کی ہدایت دیں گی۔اس کی بیوی کو فون لگائیں گی،دس باتیں سنائیں گی۔لیکن بنا چائے پیے ہوئے وہ دھم سے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''یہ مرد،سدھر نہیں سکتے' کہہ کر وہ ساتھ لائے تھیلے سے ترکاریاں نکالنے لگیں۔

''لو پالک فریج میں رکھ دو۔خراب....''

''تم کو پالک کی پڑی ہے؟''

''منو! تم یہ بات اب کیوں نکال رہی ہو؟ سالہا سال پرانی بیہودہ بات! تب تم نے کبھی نہیں کہا؟''

''کہا تھا ممی''۔بچپن کے منو پن کی طرح وہ ہونٹ باہر نکال کر روہانسی ہو جانا چاہتی تھی،وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ماں کا پھیکا پڑتا چہرہ دیکھ کر بس اتنا کہا''تب کہا تھا لیکن اس کے بعد مجھے یاد ہی آج آیا،آج ڈی کے جب آپ نہیں تھیں آیا تھا''۔

ممی سفید پڑ گئیں۔

''کیا؟ پھر؟''

''نہیں ممی! آج ایسا کچھ نہیں کیا۔ممی! میں سل کرآیا لہنگا پہن کر دیکھ رہی تھی ،پٹھو باہر پودوں کو پانی دے رہا تھا۔یہ بغیر اس سے کچھ بولے اندر میرے کمرہ میں آ گیا۔شیشے کے سامنے آ کر اس نے کندھے پکڑے تو جانے کیوں مجھے بیس سال پہلے کا یہ واقعہ یاد آ گیا۔میں نے اسے ڈانٹا،دھکادیااور دھمکایا ہے''۔

''منالی!''وہ میرے قریب آ گئیں،مجھے اپنی آغوش میں لے لیا،ہم کچھ دیر ایسے ہی چپ چاپ بیٹھے رہے،میں نے اپنا رونا ضبط کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

''تم نے جو کیا،ٹھیک کیا،کہوتو پاپا سے بات کروں؟اس کی بیوی سے؟''۔

''نہیں ممی!اب بہت دیر ہوگئی ہے،میں نے کہہ دیا جو کہنا تھا،ہوسکتا ہے کہ وہ شادی میں نہ آئے''۔

''نہ آئے،ہماری بلا سے''۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ڈی کے جیسے لوگ شرافت کا لبادہ بہت کس کر اوڑھتے ہیں،ساری معاشرتی سرگرمیاں نبھاتے بڑپن جتاتے ہیں۔آپ کی شادی کے البموں میں اپنی سنجیدہ مسکراہٹوں کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔شادی میں موجود لہنگا پہن کر اسے گھٹنوں تک چڑھائے کھیلتی ہوئی چھوٹی لڑکیوں کو گود میں اٹھا کر گال آگے کر دیتے ہیں'انکل کو کِسّی!!'۔ایسے لوگ ہر گھر میں بہت سنجیدگی سے آتے جاتے رہیں گے۔

کیا کوئی سمجھ سکے گا کہ سوتے وقت گم ہوئی پیلی تتلی نے منو کا وجود منجمد کر دیا تھا۔اس دن صبح اٹھنے تک کچھ تو تھا جسے وہ اس پسندیدہ چڈی کے ساتھ کھو چکی تھی۔اب بھی منالی خود سے پوچھتی رہ جاتی ہے۔

''میں اپنی یادوں کے بطن سے پھوٹنے والے سوالوں کا کیا کروں ؟ کیا میری پیلی تتلی والی پینٹی اب بھی اس کے پاس ہے؟''

''ہاں میرے پاس اب بھی ہے،میری ہوس کے فریم میں بند تتلی کے فریم کی طرح''۔

اس کے تصور میں ڈی کے وہی چوری چھپے نیم شہوانی ،نیم سنجیدہ مسکان کے ساتھ مسکراتا ہے۔

☆☆

نوٹ:منیشا کلشریشٹھ کی پیدائش 26اگست 1967 کو جے پور راجستھان میں ہوئی۔ان کی کہانیوں کے سات مجموعے اور پانچ ناول شائع ہو چکے ہیں ۔راجستھان کے ریگستانی علاقوں کی زندگی پر مبنی منیشا کلشریشٹھ کی معروف کہانی 'کٹھ پتلیاں' کابارہ سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ان کا پہلا ناول 'شگاف' کشمیر پر جبکہ دوسرا ناول 'شال بھانجکا' آرٹ فلم میکر پر مبنی ہے۔ناول 'ملکا' جدید ہندی ادب کے معمار بھارتیندو ہرشچندر کی محبوبہ پر مبنی ہے۔منیشا کو راجستھان ساہتیہ اکادمی سے'چندر دیوشرما پرسکار'کے علاوہ 'کتھا سمان' سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔منیشا فی الحال دہلی میں مقیم ہیں

OOO

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر''سب رس' کے شمارے پڑھے جا سکتے ہیں۔صفحہ اول پر ہی ایک نشان''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جا سکتا ہے۔

مطالعہ

بی بی رضا خاتون

رسالہ نیا دور کا مجتبیٰ حسین نمبر

ہنسنے ہنسانے کو ایک مقدس فریضہ قرار دینے والے ہر دل عزیز طنز ومزاح نگار مجتبیٰ حسین کو دنیائے ادب نے مختلف انعامات و اعزازات سے نوازا ہے ۔ اس کڑی میں تازہ ترین اضافہ اردو اکیڈمی دہلی کا بہ وقار بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اور محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اُتر پردیش لکھنؤ سے شائع ہونے والا رسالہ نیا دور کا مجتبیٰ حسین نمبر ہے۔ مدیر رسالہ نیا دور سہیل وحید نے ادارے میں مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کی شخصیت ایک بڑے فنکار اور عظیم انسان کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ عجز وانکساری انسان دوستی اور احترام آدمیت جیسی صفات مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے نمایاں اوصاف میں سے ہیں۔ موجودہ دور کے قحط الرجال میں مجتبیٰ حسین کی شخصیت صحرا میں نخلستان کی مانند ہے جس سے زندگی کے شرارے پھوٹتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں سے مل کر، ان کے بارے میں پڑھ کر انسانیت پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ ان سے مل کر یقین مستحکم ہو جاتا ہے کہ محبت ہی فاتح عالم ہے خلوص ہی کے ذریعے دلوں پر حکومت کی جا سکتی ہے۔ نصف صدی سے زائد وقت سے مجتبیٰ حسین لوگوں کے دلوں پر راج کر رہے ہیں۔ سہیل وحید نے مجتبیٰ حسین سے ملاقات کے شرف اور اپنے تاثرات کو بڑے ہی مخلصانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے فن طنز ومزاح نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی تحریریں اختلاج، احساس تنہائی، احساس برتری یا احساس کمتری میں مبتلا لوگوں کے لیے کسی ڈاکٹری نسخے سے کم نہیں ہے۔ واقعتاً بڑا فنکار اپنی تحریروں کے ذریعے حظ وانبساط کے ساتھ ساتھ بصیرت و آگہی بھی عطا کرتا ہے۔ زندگی کی ایسی سمجھ اور ایسا شعور اپنے قاری کو عطا کرتا ہے کہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھ ملانے، تمام مشکلات سے نبرد آزما ہونے اور پُر خار راہوں سے ہنس کے گزر جانے کی ادا سیکھ لیتا ہے۔

اس خصوصی شمارے میں مختلف ماہرین ادب نے مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا تنقیدی تجزیہ کر کے ادب میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا ہے۔ اس میں شامل مضامین مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

دور جدید کے معروف نقاد شمیم حنفی نے اپنے نہایت عالمانہ مضمون ''آدمی نامہ: ایک جائزہ'' میں مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری پر پُر مغز گفتگو کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کی مجتبیٰ حسین نے روایتی مزاح نگاری کے حربوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طرز اسلوب اختیار کیا ہے جس میں نہایت سادگی اور برجستگی کے ساتھ وہ کسی شخصیت کے حوالے سے زندگی کی حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں ان شگفتہ لمحوں کے سہارے قاری غیر محسوس طریقے سے بصیرت و آگہی کی ایک نئی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

شمیم حنفی نے ان کی طنز ومزاح نگاری کی ایک خوبی یہ بھی بیان کی ہے کہ اس میں Pathos کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مسکراتے لبوں کی ہنسی اور قہقہے لمحہ بھر میں اشکوں میں بدل کر آنکھوں کو پرنم کر دیتے ہیں۔ مضمون نگار کے الفاظ میں:

''وہ مزاح اور سنجیدگی کے فرق سے نہ تو باضابطہ انکار کرتے ہیں نہ ہی اس سلسلے میں کسی طرح کی فلسفیانہ موشگافی سے کام لیتے ہیں مگر ان کا کوئی بھی خاکہ اٹھایئے اسے پڑھتے پڑھتے آپ کہاں، کس نقطے پر مزاح سے نکل کر سنجیدگی کے حدود میں داخل ہو گئے۔

اس کا احساس آپ کو اس وقت ہوتا ہے جب اچانک آپ کا اپنے ردِعمل میں تبدیلی کی طرف دھیان چلا جائے''۔

شمیم حنفی نے مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے خاکے روایتی نثری قصیدوں سے مختلف ہیں۔مزاحیہ پیرائے کے باوجود وہ صاحبِ خاکہ کی ایک ایسی جامع تصویر کھینچتے ہیں جس سے ان کے اسلوب کی دلکشی اوران کی بصیرت پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے نیز ان کا عمیق مشاہدہ، ان کا مزاج اور ان کی متانت بھی قاری کو اثرانداز کرتی ہے۔مضمون نگار نے راجندر سنگھ بیدی، مخدوم محی الدین، عمیق حنفی اور باقی کے خاکوں سے دلچسپ اقتباسات پیش کیے جو ان کے مفروضات و تجزیاتی نکات کی تصدیق وتوثیق کرتے ہیں۔

دوسرا مضمون ''مولانا علی ناصر سعید عبقاتی ملقب بہ آغا روحی کا 'جاپان چلو......میری نظر میں' ہے۔جس میں انھوں نے مجتبیٰ حسین کے سفرنامے 'جاپان چلو جاپان چلو' پر تبصرہ کیا ہے جو اپنے طرز بیان کی وجہ سے خاصا دلچسپ ہے۔مولانا علی ناصر نے لکھا ہے کہ اس سفرنامے میں مجتبیٰ حسین نے بین السطور میں ہندوستانی سماج میں پنپ رہی برائیوں کو ہدف طنز بنایا ہے اس طنز میں دردمندی ہے کیونکہ اس میں فنکار کا اصلاحی جذبہ مضمر ہے۔ خصوصیت سے اردو ہندی کے لسانی جھگڑے پر فکر انگیز خیالات او رکسٹم آفیسروں کے رویوں کو لطیف طنزیہ و مزاحیہ رنگ میں پیش کیا ہے۔مضمون نگار نے ان کے فن کو بڑی خوبصورتی سے ان کے فکر وفلسفے سے جوڑا ہے۔کہیں کہیں مزاح نگار پر گفتگو کے دوران خود مضمون نگار نے بھی شگفتہ انداز بھی اپنایا ہے جیسے:

''میرا خیال تھا کہ ابن انشاء کے بعد مجتبیٰ حسین نے مجھے متاثر کیا ہے۔مجتبیٰ نے کہا کہ وہ علامہ رشید ترابی کے بعد میری خطابت سے متاثر ہوا ہے۔ابن انشاء اور علامہ ترابی دونوں ہی پاکستانی ہیں اور انتقال کر چکے ہیں گویا کہ ہمیں فی الوقت ایک دوسرے کے لیے کسی ہندوستانی یا زندہ شخص سے متاثر ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے لہٰذا ہم دونوں اس وقت تک ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن ہیں''۔

جناب فیاض رفعت نے مجتبیٰ حسین کی بے مثال فنکاری کے عنوان سے مضمون قلمبند کیا ہے۔مجتبیٰ حسین کے سیر وسیاحت کے شوق اور سفرناموں کی تخلیق کے پیش نظر مضمون نگار نے انھیں 'حیدرآبادی ابن بطوطہ' کا لقب عطا کیا ہے۔مضمون نگار کا کہنا ہے مجتبیٰ حسین اپنے سفرناموں میں فطرت کے مناظر کو زندہ اور تابندہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جزئیات نگاری میں انھیں یدطولیٰ حاصل ہے۔ان کے مزاح میں آمد کی کیفیت پائی جاتی ہے مزاح نہایت فطری اور برجستہ ہوتا ہے۔سفرنامہ جاپان چلو جاپان چلو اور مختلف خاکوں کے حوالے سے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری پر روشنی ڈالی ہے اوران کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ابھارا ہے۔ان کی ادب فہمی، دوست نوازی، انسان دوستی، دردمندی، مزاج کی شائستگی و شگفتگی کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جس کے مطالعے سے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ قاری ان کی شخصیت سے بھی روشناس ہوتا ہے۔

پروفیسر بیگ احساس کے خاکہ نما مضمون سے مجتبیٰ حسین سے ان کی قربت اوران کے فن سے عقیدت کا احساس ہوتا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر بیگ احساس نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں ان کی عجز وانکساری، دوست نوازی، سادہ لوحی، وضع داری، عفو ودرگزر سے کام لینے کی عادت خوش مزاجی وغیرہ کو مختلف واقعات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ان ہی تمام خوبیوں نے مجتبیٰ حسین کو ہر دل عزیز بنایا ہے۔انھوں نے اپنے فن اور حسن سلوک سے بے پناہ عزت اور محبت کمائی۔ فاتحین

شمال کے برخلاف اِنھوں نے جنوب سے شمال کا سفر کیا اور دلی والوں کے دل جیت لیے۔ اس مضمون کے مطالعے کے دوران قاری کی زیرلب مسکراہٹوں سے پروفیسر بیگ احساس کی بذلہ سنجی اورشگفتہ بیانی کا احساس ہوتا ہے،مثلاً:

''آدمی ترقی کے بہت زیادہ زینے تیزی سے چڑھتا ہے اور انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے گھٹنوں میں تکلیف ہونے لگتی ہے۔کم ازکم ایسی دو مثالیں ہیں۔ایک مجتبیٰ حسین کی دوسری باجپئی جی کی دونوں نے آپریشن کروائے۔ باجپئی جی کا آپریشن کامیاب رہا۔مجتبیٰ حسین کا شاید پوری طرح کامیاب نہیں ہوالیکن شاید اچھا ہی ہوا۔اپنے ہاتھ میں چھڑی لے کرمجتبیٰ حسین آج بھی بلندیاں طے کررہے ہیں۔اگرآپریشن کامیاب ہوجاتا اور ان کی چال باجپئی جی جیسی ہوجاتی تو مزاح کا کتنا نقصان ہوتا۔ ویسے بھی دراز قد آدمی کے سر سے زیادہ اس کے گھٹنوں کی اہمیت ہوتی ہے''۔

ڈاکٹرصبیحہ انور نے اپنے مضمون میں اپنے والد(وجاہت علی سندیلوی) اور مجتبیٰ حسین کے تعلقات ان کی قرابت، دوستی، ستائش باہمی اوراعتراف فن کو یادوں کے گلیاروں سے نکال کرصفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔مصنفہ کہتی ہیں کہ مجتبیٰ حسین کے لہجے کی سادگی اور انکساری انھیں اردو مزاح نگاروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے مجتبیٰ حسین کی تحریروں سے فن طنزومزاح نگاری سے متعلق ان کے خیالات کو اقتباسات کی شکل میں پیش کیا ہے۔

''زندگی کے بے پناہ غموں میں گھرے رہنے کے باوجود انسان کا قہقہہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے وسیع سمندر میں بھٹکے ہوئے جہاز کو اچانک کوئی جزیرہ مل جائے''۔

مصنفہ نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن دونوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے جہاں شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کواجاگر کیا ہے وہیں ان کی فنّی خصوصیات، زبان وبیان پر قدرت اور سادہ مگر پرکشش اسلوب نگارش کی مثالیں پیش کرتے ہوئے انھیں اردو مزاح نگاری کے صفِ اول میں نمایاں مقام کا حامل قرار دیا ہے۔

معصوم مرادآبادی نے دہلی اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ اجلاس بعنوان' ملک کے مایہ ناز طنزومزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کے ساتھ ایک شام' کی روداد بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کی ہے اس اجلاس کی صدارت معروف نقاد شمیم حنفی نے کی پروفیسر عتیق اللہ اوراسد رضا نے مجتبیٰ حسین کےفن پر مضامین پیش کیے اور مجتبیٰ حسین نے اپنی تحریروں سے محفل کو زعفران زار کردیا، دہلی کے اہل علم وادب کے لیے یہ ایک یادگار شام رہی۔

نیادور کے اس شمارے کا ایک اہم مضمون ڈاکٹر گل رعنا کا ہے۔ جو انھوں نے ''مجتبیٰ حسین اور ہم عصر مزاح نگاروں میں مماثلت'' کے عنوان سے قلمبند کیا ہے۔ اس میں انھوں نے مجتبیٰ حسین اوراردو کے اہم مزاح نگاروں مرزا فرحت اللہ بیگ، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء اور کنہیا لال کپور کی تحریروں میں مماثلت کی نشاندہی نہایت عالمانہ انداز میں کی ہے اس تحقیقی مضمون کے مطالعہ سے مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں فنّی بصیرت اور موضوعاتی تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔مصنفہ مجتبیٰ حسین اورمشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری میں مزاحیہ حربوں کے استعمال اورمشترک موضوعات کی نشاندہی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں کے موضوعات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ دونوں مزاح نگار مزاح پیدا کرنے کے لیے عموماً لفظی مناسبتوں، تلازمات، لفظی الٹ پھیر، تشبیہات او رطنز کا استعمال کرتے ہیں''(۶۳)۔

ابن انشاء اور مجتبیٰ حسین میں روانی، بے ساختگی اور برجستگی کے علاوہ اپنی قوم کے لیے دردمندی کو قدر مشترک قرار دیا ہے۔ اور کنہیالال کپور اور مجتبیٰ حسین میں مماثلت موضوعات کی سطح پر حقیقت پسندی اور زندگی سے قریب موضوعات اور جدید شاعری پر طنز شامل ہے۔

محسن خاں نے اپنے مضمون مجتبیٰ حسین اور حیدرآباد میں، حیدرآباد سے ان کی وابستگی اور لگاؤ کو بیان کیا ہے۔ جس کا ثبوت ان کی تحریروں میں جگہ جگہ حیدرآباد کے ذکر سے ملتا ہے۔ مضمون نگار نے شہر حیدرآباد کے حوالے سے مجتبیٰ حسین کے سوانحی کوائف پیش کیے ہیں۔ دہلی میں ان کے طویل قیام کے بعد اہلِ دہلی بھی ان کے دعویدار بن گئے۔ مجتبیٰ حسین نے جنوب اور شمال کی ادبی دنیا کے درمیان پُل کا کام کیا ہے۔

رفیق احمد نے' اردو طنز و مزاح کے میر کارواں مجتبیٰ حسین' کے عنوان سے اپنے مضمون میں مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ دورِ حاضر میں مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکوں' سفرناموں اور انشائیوں کے ذریعے اردو طنز و مزاح نگاری کو ایک وقار عطا کیا ہے۔ ان کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دانشورانہ خیالات کو طنز و مزاح کے پیرائے میں عام فہم بنا کر پیش کیا ہے۔

صابر سیوانی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مضمون نگار نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے کچھ ان دیکھے پہلوؤں کو اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ جیسے ان کی وقت کی پابندی کی عادت جو اردو والوں میں خال خال ہی پائی جاتی ہے۔ صابر سیوانی نے مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے معاشرے کی بدلتی قدروں کو موضوع بنا کر اخلاقی اور انسانی اقدار کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

انھوں نے دلی میں مجتبیٰ حسین کی سکوٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھنے والی مشہور شخصیتوں کا پرلطف تذکرہ کیا ہے۔

سہیل وحید نے مجتبیٰ حسین کا انٹرویو کو' عجز و انکسار کا پیکر مجتبیٰ حسین' عنوان دیا ہے اس انٹرویو میں انھوں نے اپنے حیدرآباد کے سفر اور مجتبیٰ حسین سے ملاقات کی روداد رپورتاژ کے انداز میں بیان کی ہے ایک طرح سے یہ تحریر انٹرویو اور رپورتاژ نگاری کی آمیزش ہے۔ سہیل وحید نے ایک طرف پرانے شہر حیدرآباد کی تہذیب خصوصیت سے یہاں کے پکوان میں حیدرآبادی بریانی، بگھارے بیگن، خوبانی کا میٹھا، پتھر گوشت اور حلیم کا ذکر کیا ہے اور حیدرآبادی بریانی کا موازنہ لکھنوی بریانی سے کیا ہے۔ دوسری طرف حیدرآباد کی ترقی' ہندوستان کا سب سے طویل ترین فلائی اوور، ہائی ٹیک سٹی، جوبلی ہلز اور بنجارہ ہلز کی صاف و شفاف سڑکیں، سڑکوں کے درمیان ڈیوائڈر اور دونوں جانب لگے درختوں کی ہریالی اور حسین عمارتوں کے بیچ نشیب و فراز سے گزرتے راستے حیدرآباد کے حال اور مستقبل کی خوشحالی کی ضمانت دے رہے تھے وہیں سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے شاندار ماضی کی یادیں تازہ کر رہا تھا۔ سہیل وحید نے مجتبیٰ حسین سے اپنی ملاقات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ انٹرویو میں انھوں نے جو سوالات قائم کئے ہیں ان کے جوابات مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ اس انٹرویو میں مجتبیٰ حسین نے اپنے ادبی سفر کی روداد بیان کی ہے ساتھ ہی شخصی زندگی کے سفر اور اپنی ہمسفر محترمہ ناصرہ بیگم پر بھی گفتگو کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ شخصی زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی زندگی میں ان کا تعاون غیر معمولی ہے۔

سہیل وحید نے حیدرآباد میں اپنے قیام کے دوران گل رعنا کی کتاب 'مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری' کی رسم رونمائی میں بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور اپنے تاثرات کو بیان کیا

ہے۔اس شمارے میں مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا انتخاب بھی شامل ہے جس میں چار انشائیے اپنی یاد میں' غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی' مشاعرے اور مجرے کا فرق' دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات' اردو کا آخری قاری اور خوشونت سنگھ کا خاکہ شامل ہے۔ان مضامین کی شمولیت نے اس شمارے کو دوآتشہ بنادیا ہے اس سے شمارے کی وقعت اور بڑھ گئی ہے۔ چونکہ اس انٹرویو میں مجتبیٰ حسین نے مارک ٹوئن کو اپنا پسندیدہ مزاح نگار قرار دیا ہے اس کی مناسبت سے مدیر نے اس میں مارک ٹوئن کی تحریر کا نمونہ'مقدر'(مترجم: رائحہ تقوی) کو بھی شامل کیا ہے۔

اس شمارے میں مجتبیٰ حسین سے متعلق مختلف ناقدین اور اکابرین ادب کی آراء کو بھی شامل کیا گیا ہے۔جیسے پروفیسر گوپی چند نارنگ، شہریار،فکر تونسوی، وجاہت علی سندیلوی، یوسف ناظم، حقانی القاسمی،ڈاکٹر قمر رئیس،، پروفیسر سوزوکی تاکیشی (جاپان)،مغنی تبسم،انتظار حسین، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر وغیرہ کی شمولیت سے ایسا لگتا ہے گویا آسمان ادب پر مجتبیٰ حسین نامی اس آفتابِ طنز ومزاح کے اردگرد پوری کہکشاں جگمگا رہی ہے۔ نیادور کا مجتبیٰ حسین نمبر نہایت عمدہ کاغذ اور خوبصورت ترتیب وتزئین کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔رسالے میں رنگین تصویریں مجتبیٰ حسین کے ادبی سفر کے ارتقاء کی مختلف منزلوں کا پتہ دیتی ہیں۔ بلاشبہ دورِحاضر میں مجتبیٰ حسین اردو طنز ومزاح کی آبرو ہیں شان ہیں ان کی تحریریں اردو ادب کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ نیادور کا یہ شمارہ مجتبیٰ شناسی میں ایک بہترین اضافہ ہے۔

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈیافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

آمنہ تحسین

Assistant Professor

Department of Women Education, MANUU

Gachibowli, Hyderabad - 500 032

سیفی سرونجی

Editor Intesab Aalami (Qrtly)

Saifi Library, Sironj (M.P.) 464 228

سہیل وحید

H-706, Ganga Apartment, River View Enclave

Gomti Nagar Extension Lucknow - 226 010

شاہد اختر

Gaya College, Gaya,

Bihar - 823 001

مصحف اقبال توصیفی

Flat 101, Golden Crest Apartment, 12-2-823/B/5,

I.T. Colony, Mehdipatnam - 500 028

محمد یحییٰ جمیل

Baitul Jalil-9, Aseer Colony,

Post: VMV At: Amravati - 444604

رؤف خیر

9-11-137/1, Moti Mahal, Golconda

Hyderabad - 500 008

احسن ایوبی

C-4/3 Suroor Apartment,

Sir Syed Nagar,Aligarh

جمال اویسی

Head, P.G. Dept. of Urdu, Ganesh Dutt College,

Begusarai - 851 101

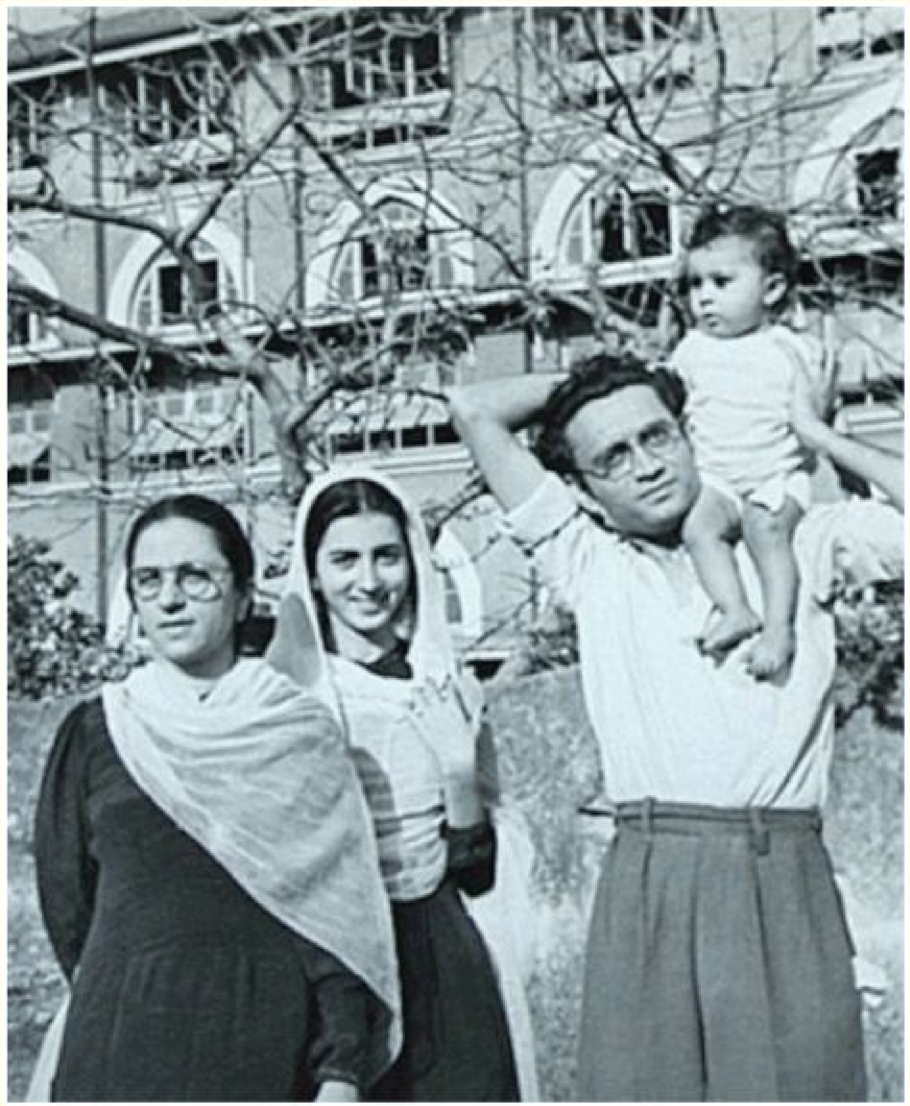

سعادت حسن منٹو اپنی بیگم صفیہ اور سالی ذکیہ کے ساتھ اپنی بیٹی کو کندھے پر اٹھائے ہوئے

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.81, Issue-02 February, 2019 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469